پاکستان کی صحافت کو خطرہ

جنگجوئیت، سیکورٹی و سیاست کا مہلک جال

CPJ Committee to Protect Journalists

www.cpj.org

پاکستان کی صحافت کو خطرہ

جنگجوئیت، سیکورٹی و سیاست کا مہلک جال

مئی ۲۰۱۳ء

جاری کردہ

الزابتھ رُوبن

کمیٹی ٹو پروٹیکٹ جرنلسٹس کی ایک خصوصی رپورٹ

فہرست

اس رپورٹ کے بارے میں ---------- 1

تعارف منجانب باب ڈائٹز---------- 2

باب 1

ولی خان بابر کا قتل---------- 5

بابر کراچی میں ایک غیر معمولی شخصیت کے حامل: مشہور اور خوب رو، بابر بلوچستان سے تعلق رکھنے والے پشتون تھے۔ وہ جیو ٹی وی کا ایک ابھرتا ہوا ستارہ تھے، جو ایک اینکر کی حیثیت سے انہیں آگے بڑھا رہا تھا۔ ان کا قتل ایک بدبختانہ منشور فراہم کرنا ہے جس کے توسط سے پاکستان میں میڈیا، انصاف، اقتدار، اور سیاست کی صورتحال کا مطالعہ کرنا ہے۔

لفظ بہ لفظ: دھمکیاں، وعدے، اور خوف ---------- 21

باب 2

خیبر پختونخواہ میں ایک موت---------- 23

ضابطے کے لحاظ سے، مکرم خان عاطف کی موت میں کوئی راز پنہاں نہیں ہے۔ وہ دہشت گردی کی جنگ کا ایک اور شکار ہیں، جو امریکی حکومت کی پشت پناہی والے اخباری آؤٹ لیٹس کیلئے اپنی رپورٹنگ کی وجہ سے طالبان کے ذریعے انجام دیا گیا تھا۔ لیکن بے ضابطہ طور پر، بہت سارے لوگ اس بات کو نہیں مانتے کہ مکرم کو طالبان کے حکم پر ہلاک کیا گیا ہے، کم از کم ان وجوہ کی بناء پر جو عوام کے سامنے بیان کی جا رہی ہیں۔

VOAرپورٹروں کیلئے، ایک مشکل توازن---------- 33

باب 3

دہشت پیدا کرنا، ساز باز، اور بدلے کی کارروائی---------- 34

کوئی دو سال پہلے، مشہور صحافیوں نے انٹلی جنس ایجنسیوں کی جانب سے خود کو موصول ہونے والی دھمکیوں کو منظر عام پر لانا شروع کیا۔ یہ ایک خطرناک حساب کتاب تھا، لیکن انہوں نے یہ توجیہ پیش کی کہ خاموشی کی وجہ سے ہی دہشت پیدا کرنے کا حوصلہ ملتا رہا ہے۔ کیا ان کی چالبازی کارگر ہوئی ہے؟ جانے مانے لوگوں کیلئے تو اس نے کچھ تحفظ فراہم کیا۔ لیکن چکاچوندھ روشنی سے دور رہ کر کام کرنے والے صحافیوں کیلئے دھمکیاں ابھی بھی کچھ حد تک بدتری کی سمت گامزن رہیں۔

'اگر مجھے کچھ ہو جائے'---------- 44

نتیجۂ کلام---------- 46

مئی 2011 میں سلیم شہزاد کی موت نے پورے پاکستان میں صحافیوں میں اسی طرح سے قوت بھر دی جس طرح بعض دیگر واقعات نے قوت دی تھی۔ ایک مختصر عرصے کیلئے ان کی قوت کا احساس ہوا۔ انہیں اعلی درجے کی چھان بین کی اجازت ملی۔ انہوں نے ان انٹلی جنس افسران کا نام لیا جنہوں نے شہزاد اور دوسرے صحافیوں کو دھمکیاں دی تھیں۔ لیکن اس کے دو سال کے بعد، ان کی کوششوں کا بہت ہی معمولی نتیجہ برآمد ہوا ہے۔

CPJ کی تجاویز---------- 51
CPJ کی جانب سے پاکستانی حکام، پاکستانی نیوز میڈیا، اور عالمی برادری کو مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی گئی ہیں

ضمیمہ---------- 54
2003-12 میں ہلاک شدہ صحافیوں کے تعلق سے کیپسول کی رپورٹیں

اس رپورٹ کے بارے میں

یہ رپورٹ ایک خود مختار صحافی، **ایلزابیتھ ریوین** نے تحریر کی تھی جنہوں نے *دی نیو یارک ٹائمز میگزین* سمیت، متعدد مطبوعات کیلئے پاکستان اور جنوبی ایشیاء کا احاطہ کیا ہے۔ انہوں نے افغانستان، عراق، اور بلقان سمیت، دنیا بھر کے متصادم خطوں سے رپورٹیں پیش کی ہیں۔ کمیٹی ٹو پروٹیکٹ جرنلسٹس (صحافیوں کے تحفظ کی کمیٹی) نے پاکستان میں اخباری میڈیا کے افراد کو درپیش پرخطر حالات کے سلسلے میں یہ آزادانہ تفتیش انجام دینے کیلئے ریوین کو بحال کیا۔

CPJ کے ایشیا پروگرام کے منتظم **باب ڈیٹز** نے اس رپورٹ پر تعارف تحریر کیا اور سفارشات تیار کیں۔ 2003 سے 2012 تک ہلاک ہونے والے صحافیوں سے متعلق ضمیمہ پچھلی دہائی میں CPJ کے عملے کے ذریعے کی گئی تحقیق پر مبنی ہے۔ CPJ کے اسٹائگر فیلو، **سمت گلہوترا** نے ہلاک شدہ صحافیوں کے تعلق سے کیپسول کی رپورٹوں پر نئی رپورٹنگ کا تعاون کیا۔ گلہوترا نے کئی اور حصوں پر بھی تحقیق پیش کی ۔

CPJ کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان 2003 کے بعد سے پریس کیلئے دنیا کے چار مہلک ترین ملکوں میں سے ایک ہے۔ یوں تو کئی ایک صحافیوں کی موت خودکش بم دھماکوں میں یا ملک میں تصادم سے تعلق رکھنے والے دیگر حالات میں ہوئی، مگر کم از کم 23 افراد کو ہدف بناکر قتل کیا گیا ۔ CPJ کی تحقیق سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پریس مخالف تشدد میں بریت کے معاملے میں پاکستان دنیا کے ایک بدترین ریکارڈ کا حامل ہے۔ پچھلی دہائی میں ایک بھی صحافی کے قتل میں کسی ایک کو بھی سزا نہیں ملی ہے۔

اس رپورٹ میں رپورٹر ولی خان بابر اور مکرم خان عاطف کو نشانہ بنا کر مارے جانے کے معاملے اور صحافیوں کے ہلاکتوں کی جڑوں کا معائنہ کیا گیا ہے۔ آزاد اور طاقتور ہوتے ہوئے بھی ملک کے پریس کو جنگجوؤں، سیاسی جماعتوں، مجرموں، انٹلی جنس ایجنٹوں، اور فوجی و سرکاری اہلکاروں کی جانب سے غیر معمولی خطرے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ صحافیوں کے قاتلوں کو سزا دینا اس ملک کے مستقبل کیلئے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

تعارف

منجانب باب ڈائٹز

CPJ کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان میں پچھلی دہائی میں براہ راست اپنے کام کے سلسلے میں کم از کم 42 صحافی ہلاک ہوے ہیں — جن میں سے 23 کا قتل ہوا ہے۔ 2003 کے بعد سے قتل کی ایک بھی گتھی سلجھی ، کسی ایک معاملے میں بھی سزا نہیں سنائی گئ۔ پاکستانی اور بین الاقوامی صحافی تنظیموں کی جانب سے لگاتار مطالبوں کے بعد بھی، ان کیسوں میں سے کسی ایک کو بھی معتبر ٹرائل کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔

بریت کے اس کامل ریکارڈ نے صحافیوں کیلئے روز افزوں طور پر پرتشدد ماحول کی آبیاری کی ہے۔ پچھلے پانچ برس میں موتوں میں زبردست اضافہ ہوا ہے اور آج پریس کے معاملےمیں پاکستان دنیا بھر کے مہلک ترین ممالک میں مستقل طور پر سر فہرست ہے۔

یہ تشدد سبھی شہریوں کو بنیادی انسانی حقوق عطا کرنے کی حکومت کی جد وجہد کے تناظر میں پیش آتا ہے۔ خود مختار حیومن رآئٹس کمیشن آف پاکستان نے مارچ 2012 میں اپنی سالانہ رپورٹ میں اس کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا، "جنگجوئیت، بڑھتی ہوئی لاقانونیت، اورنسلی، طبقاتی، اور سیاسی تشدد نے ملک کے ایک بڑے حصے میں لوگوں کیلئے سلامتی اور قانون اور امن و انتظام کو یقینی بنانے کی حکومت کی نااہلیت کو ظاہر کر دیا ہے۔"

یہ رپورٹ اس ماحول میں ہے جہاں رپورٹر الیزابیتھ ریوبن نے دو صحافیوں – کراچی میں ولی خان بابر— اور قبائلی علاقوں میں مکرم خان عاطف – کی ابدافی ہلاکت نیز ساز باز کرنے، دہشت پھیلانے، اور بدلہ لینے کی مخفی ثقافت کی چھان بین کی ہے جس کی وجہ سے اتنی موتیں ہوئی ہیں۔ ان کی رپورٹ میں یوں درج ہے:

- دھمکیاں دینےوالوں کا ایک سلسلہ ہے جس میں صرف جنگجو، مجرم اور آقائے جنگ ہی نہیں، بلکہ سیاسی، فوجی اور انٹلی جنس کے کارندے بھی شامل ہیں۔
- ایک کمزور شہری حکومت ہے، جو انٹلی جنس سروس، فوج، اور سیاسی جماعتوں میں شامل مجرمانہ عناصر کی خواہش کو تسلیم کر لیتی ہے۔
- ایک انٹلی جنس سروس ہے، جو جارحانہ انداز میں ایک سیاسی ایجنڈے کی پیروی کرتی ہے؛ جو اخباری میڈیا پر دباؤ ڈالتی ہے، ساز باز کرتی ہے اور انہیں خوف میں مبتلا کرتی ہے؛ اور جو بسااوقات طالبان اور دیگر جنگجوؤں کے ساتھ باہمی تعاون کرتی ہے یا انہیں فعال بناتی ہے۔
- ایک تعزیری نظام انصاف ہے، جو کمزور ہے اور جس کے پاس آزادی کا فقدان ہے، جس نے سیاسی دباؤ کے تئیں اس کو زد پذیر بناکر چھوڑ دیا ہے۔
- پولیس ہے، جو فارنسک اور سیکیورٹی جیسے بنیادی شعبوں میں ناکافی تربیت یافتہ ہے۔
- سرکاری اہلکاران ہیں، جنھیں وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی آزادی کی آب و ہوا میں صحافیوں کو خوف میں مبتلا کرنے میں آزادی کا احساس ہوتا ہے۔

- اور اخباری میڈیا ہے، جس کے آزاد اور طاقت ور ہوتے ہوئے بھی اس میں انٹلی جنس سروسز، فوج اور سیاسی جماعتوں کے ذریعے ساز باز کی جاتی ہے۔

نجم سیٹھی نے CPJ کو بتایا، "یہاں معاملہ بہت سخت ہے"۔ دی فرائڈے ٹائمز کے ایڈیٹر اور جیو ٹی وی پر اردو زبان کے ایک مشہور سیاسی پروگرام کے میزبان نجم سیٹھی اور جگنو محسن، ان کی بیوی اور ساتھی صحافی سالوں سے شدید خوف کے سائے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ لاہور میں مقیم سیٹھی نے بتایا، "کسی کی کبھی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا طالبان آپ پر بندوق تانے ہوئے ہیں یا ایجنسیاں آپ پر بندوق تانے ہوئے ہیں۔ اور کبھی کبھی آپ کو اس وجہ سے معلوم نہیں ہوتا ہے کیونکہ ان میں دونوں ایک دوسرے کی ایماء پر کام کر رہے ہوتے ہیں۔"

سیٹھی جس طرح جنگجو گروپوں پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں،ویسی ہی سخت نکتہ چینی وہ حکومت، فوج اور ملک کی انٹلی جنس ایجنسیوں پر بھی کرتے ہیں۔ افغانستان کی سرحد سے لگے وفاق لحاظ سے زیر انتظام قبائلی علاقوں میں، جہاں عاطف کو ہلاک کیا گیا تھا، دھمکیاں دینےوالوں میں فوج اور انٹلی جنس سروسوں، جنگجو، اسلحہ اور منشیات کے سوداگر، اور آقائے جنگ کے متعدد گروپ شامل ہیں جہاں حکومت ایک دوسرے کے خلاف کردار ادا کرتی ہے۔ ملک کا سب سے بڑا شہر کراچی، جہاں بابر کو ہلاک کیا گیا تھا، برتری کی جنگ لڑنے والی سیاسی جماعتوں کا میدان جنگ ہے، جنگجو گروپ اندرونی علاقے میں پس پشت فوجی ترتیب قائم کر رہے ہیں، اور مجرموں کے گروہ منافع کے بھوکے ہیں۔ کراچی میں کم از کم تین صحافیوں کو پچھلی دہائی میں اپنے کام کی وجہ سے ہلاک کر دیا گیا تھا۔

انٹلی جنس سروسوں کو خود اپنے ایجنڈے کی پیروی کرنے میں آزادی کا احساس ہوتا ہے؛ ان کے اعمال جزوی طور پر ملک بھر میں ہر طرح کے تشدد کیلئے آزادی کا سبب اور جزوی طور پر اس کا نتیجہ ہیں۔ 1947 میں ملک کی تشکیل کے وقت سے تین بار اقتدار پر قابض ہوجانے والی فوج پر معمولی نکتہ چینی کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے اور وہ آواز اٹھانے کی جسارت کرنے والے صحافیوں کو دھمکی دینے میں کبھی نہیں جھجکتی ۔ CPJ کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ پچھلی دہائی میں کم از کم سات صحافیوں کے قتل میں حکومت، فوج، اور انٹلی جنس کے اہلکاروں کے ملوث ہونے کا شبہہ ہے۔ کمزور شہری حکومتوں کا ان پر بہت کم اختیار ہے۔

اس معاشرتی ماحول میں مصروف عمل اخباری میڈیا آزاد اور طاقتور ہے۔ نجی کیبل ٹیلی ویژن نشر نگاروں کا دھماکہ جو جنرل پرویز مشرف کی ماتحتی میں شروع ہوا اس کے نتیجے میں آج 90 سے زائد اسٹیشن ہیں۔ پرنٹ اور ریڈیو آؤٹ لیٹس عروج پا رہے ہیں۔ لیکن صحافیوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ فوج اور انٹلی جنس سروسوں کے ذریعے میڈیا آؤٹ لیٹس میں ساز باز کی گئی ہے، اور اخباری تنظیموں نے بھی موافق سیکیورٹی اور تربیتی اقدامات کے ساتھ بڑھتے ہوےخطرات کو پورا نہیں کیا ہے۔ حالیہ سالوں میں، اس صنعت کے اخباری منیجروں نے پاکستانی میڈیا کے معیار اور سیکیورٹی کو بڑھانے کیلئے متعدد مخلصانہ کوششیں کی ہیں۔ بیشتر تو اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس پر ابھی بھی پیشرفت جاری ہے۔

مئی 2011 میں، CPJ کے ایک وفد نے صدر آصف علی زرداری اور متعدد کابینی ممبروں سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں صدر نے پریس مخالف تشدد میں بریت کے ملک کے ریکارڈ کو درست کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن حقیقت میں، کچھ بھی تبدیلی نہیں ہوئی،

اور ریکارڈ مزید بدتر ہی ہوا ہے۔ CPJ کے دستاویز بند کردہ تقریباً ہر ایک معاملے میں ابتدائی پولیس رپورٹ درج کروانے کے علاوہ شاید ہی کچھ ہوا ہے۔ 2012 میں، جب اقوام متحدہ کی تعلیمی شاخ UNESCO نے دنیا بھر میں صحافیوں کے قتل میں بریت سے مقابلہ آراء ہونے کیلئے منصوبے کا مسودہ تیار کیا تو، پاکستان نے، ناکام انداز میں ہی سہی، اسے پٹری سے اتارنے کیلئے غضبناک انداز میں لابی سازی کی۔ اس وقت ایک سینئر پاکستانی اہلکار نے CPJ کو بتایا تھا، "یہ کہنا غلط ہوگا کہ پاکستان میں غیر حل شدہ معاملات کی شرح زیادہ ہے۔" حقائق 23— قتل، سبھی غیر حل شدہ— کچھ اور ہی بتاتے ہیں۔

پاکستان کے لیڈروں نے اصول کی حکمرانی اور بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت دینے کی اپنی جوابدہی پوری نہیں کی۔ منتخبہ حکومت ایک فوجداری نظام انصاف میں، جو آزاد ہے، اپنے شہریوں کی ممنون ہوتی ہے، اس کے تفتیشی کارکنان اور پروسیکیوٹروں کو کامیاب مواخذے کرنے کیلئے عملے اور وسائل کا تعاون حاصل ہوتا ہے۔ بہت سے صحافیوں کے قتل کے واقعات کا مواخذہ دہشت، خلل اندازی یاسیاسی جماعتوں، فوج اور انٹلی جنس سروسوں کی بدتری کی وجہ سے نہیں ہو پاتا ہے۔ اس کا خاتمہ ہونا ضروری ہے۔

اس پست ہمتی کو دیکھتے ہوئے، پاکستانی صحافیوں نے خود سے ہی ان مسائل کا ازالہ کرنا شروع کر لیا ہے۔ بڑے بڑے میڈیا ہاؤس تربیت اور سیکیورٹی کو استحکام بخش رہے ہیں۔ کچھ تو اخلاقی برتاؤ کیلئے رہنما حدیں طے کر رہے ہیں۔ صحافی حضرات پریس مخالف ایذا رسانی کے خلاف آواز اٹھانے کیلئے پیشہ ورانہ استحکام کی طویل وراثت پر گامزن ہو رہے ہیں۔

ملک کے ایک مضبوط ترین جمہوری — اور یہاں کے سب سے پر خطر— ادارے کی حیثیت سے پریس کے پاس مؤثر تدابیر کا پتہ لگانے کیلئے ایک ساتھ آنے کی اہلیت بھی ہے اور اس کو اس چیز کی فوری ضرورت بھی ہے۔

باب ڈیٹز کمیٹی ٹو پروٹیکٹ جرنلسٹس (صحافیوں کے تحفظ کی کمیٹی) کے ایشیا پروگرام کے منتظم ہیں۔ انہوں نے سوات میں حکومت کی فوجی جارحیت کے دوران 2009 میں پاکستان سے رپورٹ پیش کی تھی، اور وہ 2011 میں صدر زرداری سے ملاقات کرنے والے CPJ کے وفد میں بھی شامل تھے۔

1. ولی خان بابر کا قتل

13 جنوری 2011 کو، جیو ٹی وی کے 28 سالہ نامہ نگار ولی خان بابر، کراچی میں گروہی تصادم کے دوسرے دن کی کوریج کرنے کے بعد واپس گھر جا رہے تھے ۔ افغانستان سے لگی سرحد کے قریب بلوچستان میں زوب سے تعلق رکھنے والے پشتون بابر ٹی وی پر آنے والوں میں ایک جامہ زیب، مشہور اور منفرد چہرہ تھا ۔ جیو کیلئے کراچی میں ایک پشتون کی موجودگی بڑی مفید تھی، اور اسی وجہ سے اس اسٹیشن نے انہیں ایک اینکر بننے کی تربیت حاصل کرنے کیلئے بیرون ملک بھیجنے کا منصوبہ بھی بنایا تھا۔

پشتون، جن کی نمائندگی پشتون قوم پرست عوامی نیشنل پارٹی کرتی ہے، اور مہاجر، جن کی نمائندگی متحدہ قومی موومنٹ کرتی ہے، دونوں کو پرتشدد حملوں اور جوابی حملوں میں اس سطح تک الجھا دیا گیا ہے کہ جس کی مثال 1990 کی دہائی کے بعد سے دیکھنے میں نہیں آئی ہے، اور بابر اس مسئلے کا کوریج کرنے اور انہیں روکنے میں بہت پرجوش تھے۔ ایک وقت تھا جب وہ حریف قوتوں کے ساتھ آسانی سے گھل مل جانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ انھوں نے تصادم، اغوا برائے تاوان، منشیات کی تجارت، زمین پر قبضہ کی رپورٹیں پیش کی تھیں۔ ان کو معلوم تھا کہ وہ کتنے خطرے میں ہیں، لیکن وہ رجائیت پسند تھے اور، جیسا کہ انھوں نے اپنے ایک ساتھی کو بتایا تھا کہ وہ ANP اور MQM کے بیچ صلح بندی کا راستہ بنا سکتے ہیں۔ لیکن آگے چل کر وہ گھبرا گئے۔ انھوں نے اپنے باس کو بتایا تھا کہ MQM ان کے پیچھے پڑگیا ہے۔ انھوں نے اپنے ایک پشتون ساتھی کو بھی بتایا تھا کہ ان کے خیال میں لوگ گھر تک ان کا پیچھا کر رہے ہیں اور ان کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھ رہے ہیں۔ جیو کے ایک سپروائزر نے بتایا "میرے پاس ہر دن دھمکیوں بھرے فون آتے رہتے ہیں، اور بدقسمتی سے ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ وہ جو بات کہہ رہے ہیں وہ کتنی سنگین ہے۔"

اس سے قبل والے دن، 12 جنوری 2011 کو، محمد شاہ رخ خان، معروف بہ مانی، کو بابر کے گھر تک ان کا تعاقب کرنے کی ہدایت دی گئی تھی، لیکن اس کو رپورٹر کا پتہ نہیں چل سکا۔ ایک نوجوان مہاجر اورMQM کے ممبر مانی نے ان کے والد کی پان اور مٹھائی کی دکان میں اس وقت تک کام کیا تھا جب تک وہ ایک کمیونٹی آرگنائزر اور اسکواڈ لیڈر، MQM کے فیصل موٹا کے ساتھ شامل نہیں ہوئے تھے۔ مانی کے MQM میں شامل ہوجانے کے بعد، اس نے — سگریٹ بیچنے، دلالی کرنے، انتخابی مہم چلانے کے متعدد کام کیے۔ 13 جنوری کو اسے موٹا کا ایک فون آیا جس نے اسے کہا کہ واپس جیو کے دفاتر میں جائے جہاں MQM کا ایک اور کامریڈ بابر کا پیچھا کرنے کیلئے اسے ایک کار دے گا۔

مانی قریب عصر کے وقت جیو کے دفاتر کے سامنے پہنچا۔ MQM کے دو آدمی، ذیشان اور لیاقت، پہلے سے وہاں موجود تھے اور انہوں نے سلور سوزوکی، جو بابر کی کار کے پیچھے کھڑی تھی، اس کی چابیاں اس کے حوالے کیں۔ انہوں نے مانی کے موبائل میں50 روپے کا کریڈٹ ڈلوایا اور کہا کہ جب بابر باہر نکل آئے تو فون کردے۔ رات قریب 8:30 بجے بابر اپنی کار میں سوار ہوئے اور گھر کی سمت جانے لگے۔ مانی نے ذیشان کو فون کیا: "وہ جا رہا ہے۔" پھر اس نے اپنے باس، فیصل موٹا کو فون کیا، جس نے فون پر ہی حتمی روٹ بتاتے رہنے کیلئے اسے فون پر روکے رکھا۔ مانی فون پر یہ راستہ بتاتے ہوئے چل رہا تھا – صدر علاقے سے ہوکر، کرکٹ کی لائنوں کے ساتھ، ڈاکخانے اور ایسو اسٹیشن سے آگے۔ اور پھر اچانک وہاں ذیشان موجود تھا۔ بابر لیاقت آباد میں، جو خصوصی طورپر مہاجروں کی بستی ہے، ٹریفک میں پھنس تھا گئے تھے، اور مانی ان کے پیچھے تھا۔ ذیشان ٹوپی لگائے ہوئے مانی کے سامنے سے جاتے ہوئے بابر کی کار تک گیا، اور کالے

رنگ کا ایک پستول اوپر اٹھایا اور کھڑکی کے اندر چھ یا سات گولیاں داغ دیں۔ ہمیں یہ ساری باتیں مانی کے اقبالیہ بیان کے ویڈیو ٹیپ سے معلوم ہوئی ہیں، جو آن لائن بھی مل سکتا ہے۔

مانی دہشت زدہ ہو گیا تھا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس نے فیصل موٹا کو فون کیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ جس وقت وہ فیصل موٹا کے گھر پہنچا تو اس وقت MQM کے بہت سارے آدمی وہاں پہلے سے موجود تھے - جس میں وسیم کمانڈو اور شاہد کمانڈو جیسے ناموں کے لوگ بھی تھے۔ ذیشان بھی اس کے فوراً بعد ہی وہاں پہنچ گیا اور پھر موٹا آیا۔ موٹا نے مانی سے کہا کہ اطمینان سے رہو اور منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالنا ۔ لیکن مانی اگلے دن لاہور چلا گیا جہاں وہ دو مہینے تک رہا۔ کراچی واپس آنے پر وہ گلشن میں موٹا کے دفتر گیا۔ اس وقت تک پولیس ان کے پیچھے لگ چکی تھی، اور موٹا نے انہیں حیدرآباد چلے جانے کاحکم دیا تھا جہاں ایک اور پلاٹر لیاقت چھپا ہوا تھا۔ لیکن اب بہت دیر ہوچکی تھی۔ موٹا کے دفتر سے نکلنے کے فوراً بعد ہی، مانی اور چار دوسرے لوگوں نے پولیس کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ فائرنگ شروع ہوگئی۔ رنگ لیڈر، موٹا کسی طرح فرار ہوگیا۔

7 اپریل 2011 کو پولیس نے ایک نیوز کانفرنس منعقد کی اور مانی و دیگر چار لوگوں کی گرفتاری کا اعلان کیا۔ بارہ دن کے بعد مشترکہ تفتیشی ٹیم کے سامنے مشتبہ افراد کے بیان سے ماخوذ قتل کی تفصیلات *پاکستان ٹوڈے* میں آنا شروع ہوئیں۔ ٹیم کی رپورٹ کے مطابق، ایسا لگتا ہے کہ موٹا کو جنوبی افریقہ میں مقیم MQM کے کارندے آغا مرتضا سے یکم جنوری کے آس پاس اس قتل کا حکم ملا تھا۔ تفتیش کاروں کے بقول آغا نے سالوں تک مختلف ہٹ سیلز کو کنٹرول میں رکھا تھا۔ موٹا نے اپنے گھر پر 7 جنوری کو ایک میٹنگ منعقد کی تھی اور MQM کے متعدد ممبروں کو مختلف مقامات پر بابر کی نگرانی کرنے کے لیے مامور کیا تھا، ان مقامات میں رپورٹر کی رہائش گاہ اور رپورٹر کی رہائش گاہ کے قریب پشاوری آئس کریم شاپ بھی شامل تھی۔

اس شہر میں جہاں ہر مہینے 100 سے زیادہ لوگوں کا قتل ہوجاتا ہے، بہتوں کو اذیت پہنچائی جاتی ہے اور ان کے اعضاء کاٹ دیے جاتے ہیں، ایسے میں اس طرح ایک لمحے کیلئے تو ایسا لگا کہ عدلیہ حرکت میں آ گئی ہے، پوچھ تاچھ اور گرفتاریاں ہو گئی تھیں۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ کوئی شخص عدلیہ میں رخنہ ڈالنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ بابر کا قتل ہونے کے ایک ہفتے بعد، ایک ایک کرکے، پولیس کا ایک مخبر، دو پولیس کانسٹبل اور ایک تفتیشی آفیسر کے بھائی قتل کر دیے گئے۔ ان سبھی کا تعلق بابر کیس کی تفتیش سے تھا۔ *ایکسپریس ٹریبیون* میں شائع شدہ بیان کپکپا دینے والا تھا: پہلا شکار ایک پولیس مخبر تھا جو بوری میں بند مردہ حالت میں ملا تھا نیز اس کی جیب میں پرچی تھی۔ پیغام میں کہا گیا تھا کہ کانسٹبل ارشد کنڈی "اگلا" شکار ہوگا۔ کنڈی اس مخبر کو استعمال کرتا تھا۔ دوسرا شکار حقیقت میں پولیس کانسٹبل آصف رفیق تھا جسے موٹر سائیکل پر سوار دو آدمیوں نے راہ چلتے گولی ماردی تھی۔ وہ اس وقت جائے وقوعہ پر موجود تھا جب بابر کا قتل ہوا تھا اور اس نے پلاٹرز کی گاڑی پہچان لی تھی۔ مرنے والا تیسرا شخص در اصل کنڈی تھا، اسے بھی موٹرسائیکل سواروں نے راہ چلتے گولی ماردی تھی۔ چوتھا شکار پولیس چیف شفیق تنولی کا چھوٹا بھائی تھا، جو لیاقت آباد سے تفتیشی ٹیم کا حصہ بنا تھا۔ یہ محض اتفاق ہوسکتا ہے، مگر عین اسی وقت، *پاکستان ٹوڈے* کے صحافی طارق حبیب کو، جنھوں نے بابر کی ہلاکت سے متعلق جاءنٹ انویسٹیگیشن ٹیم کی رپورٹ کی تفصیلات شائع کی تھیں، کراچی پریس کلب کے ان کے

ساتھیوں کے مطابق، ان کو بغیر کسی طرح کی وضاحت کے نوکری سے نکال دیا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ حبیب کو دھمکیاں ملیں، کراچی کی گلیوں میں ان کا تعاقب کیا گیا اور آخرکار انہیں اپنی رہائش تبدیل کرنا پڑی۔

9 اپریل کو، بابر کے مقدمے میں مشتبہ افراد کی گرفتاری کے دو دن بعد، سندھ کے وزیر داخلہ اور پاکستان پیوپلز پارٹی کے سینئر نائب صدر ذو الفقار مرزا نے اعلان کیا کہ MQM لیڈر الطاف حسین کی جانب سے پڑنے والے دباؤ کے سبب وہ اپنے کام سے سبکدوش ہونے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ اگلے ہفتوں میں، مرزا نے MQM کے خلاف اپنے غیظ و غضب کا اظہار کیا، اور کہا کہ بابر کے قتل اور اس کے بعد ہونے والی ہلاکتوں کیلئے وہی ذمہ دار ہیں، کہ مغربی حکومتیں پارٹی کی پشت پناہی کر رہی ہیں، اور حسین نے انہیں بے دخل کرنے کیلئے صدر آصف علی زرداری کو چھ بار فون کیا۔ فتنہ پردازی کے شکار سیاستداں کی بہکی بہکی باتیں؟ سچائی؟ ایک سیاسی ایجنڈا؟ "جب آپ حقیقت بیانی شروع کردیتے ہیں تو پھر کوئی روکنے والا نہیں ہوتا، اورذو الفقار نے آگے چل کر یہ سمجھ لیا کہ وہ پیوپلز پارٹی کو نقصان پہنچا رہے ہیں،" یہ باتیں ایک قریبی دوست اور کراچی میڈیا مالک نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتائیں کہ کبھی تو اس قدر تیز و طرار رہنے والے مرزا 2012 کے بعد ایکدم سے خاموش کیوں ہوگئے۔ دوسروں نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ ان کا بیٹا پارلیمنٹ میں منتخب ہوگیا تھا۔

لیکن سب سے بڑے سوال اب تک رہتے ہے: کیا MQM تفتیش کو روکنے کیلئے اس حد تک چلا گیا تھا؟ اگر ایسا ہے تو کیوں؟

بابر کا قتل ایک بدبختانہ مخروطہ فراہم کرتا ہے جس کے ذریعے اخباری میڈیا اور نظام انصاف کی صورتحال، اقتدار اور سیاست کی نوعیت اور اکثر و بیشتر پاکستانیوں پر مغرب کی پالیسی کےزہریلے اثرات کا مطالعہ کرنا ہے۔

تاریخ اور آبادیاتی معلومات کراچی میں قتل کی وجہوں سے کبھی بھی زیادہ الگ نہیں رہی ہیں۔ MQM کی بنیاد ایک باحوصلہ طالب علم حسین نے 1984 میں رکھی تھی، جو مہاجروں – اردو بولنے والے وہ تارکین وطن جنہوں نے مادر وطن کی خاطر تقسیم کے دوران ہندوستان کو چھوڑ دیا تھا – کے حقوق کے نقیب بنے اور انہیں پاکستان کے اندر ایک علاحدہ ہستی قرار دیا۔ انہوں نے ایک انتہائی طاقتور سیاسی جنگجو جماعت تشکیل دی، ایک ایسی جماعت جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ طبقات سے الگ ہو، جو لوگوں کی جماعت ہو، اور جاگیرداری کے مخالف ہو۔

معاملہ یونہی چلتا رہا۔ مہاجرین میں تعلیمی شرحیں زیادہ اورشرح پیدائش کمتر ہیں، لیکن ان کے پاس کوئی زمین نہیں ہے جسے وہ استعمال کریں۔ سندھیوں کے پاس سندھ ہے۔ پشتونوں کے پاس خیبر پختونخواہ ہے۔ پنجابیوں کے پاس پنجاب ہے۔ بلوچ کے پاس بلوچستان ہے۔ سندھ میں موجود مہاجرین محصور ذہنیت کے ساتھ شہروں میں جا بسے۔ پچھلی تین دہائیوں میں انہوں نے سندھیوں، پشتونوں، PPP، اور ANP سے جنگیں کی ہیں؛ کراچی میں ہر ادارے میں وہ موجود ہیں اور، بلا شبہہ، انہوں نے انٹر سروسز انٹلی جنس ڈائرکٹوریٹ، یا آئی ایس آئی، اور پاکستانی فوج سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ان کی کوشش جینے اور پاکستان کی اقتصادی راجدھانی کراچی پر قبضے کے بارے میں ہے۔

1980 کی دہائی میں، جنرل ضیاء الحق نے PPP کو برباد کرنے کیلئے MQM کی حوصلہ افزائی کی تھی اور انہیں مضبوط بنایا۔ آخر کار، انہوں نے ایک فوجی انقلاب میں اقتدار پر غلبہ حاصل کر لیا جس میں PPP کو اکھاڑ کر پھینک دیا گیا اور PPP کے ہیرو، وزیر اعظم ذو الفقار علی بھٹو کو تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا۔ برتری کی جنگ سارے شہر میں پھیل گئی اور 1990 تک تشدد اس انتہا کو پہنچ گیا کہ کراچی کی گلیاں کٹے ہوئے اعضاء والی لاشوں کیلئے مدفن میں تبدیل ہوگئیں۔ MQM نے نہ صرف حریف پارٹی کے جنگجوؤں کا بلکہ صحافیوں سمیت، اپنی نکتہ چینی کرنے والے ہر شخص کا بہیمانہ قتل کیا۔ بے نظیر بھٹو نے اس تشدد کو مزید بہیمیت کے ساتھ روکنے کی کوشش کی۔ ان کے جانے مانے وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر نے ایک دہشت مخالف فورس تیار کی جو MQM کے انٹلی جنس نیٹ ورک اور ان کے سیلز میں گھس گئی اور پھر عدلیہ سے ماورا سینکڑوں ہلاکتیں انجام دی گئیں۔

1999 میں، جب جنرل پرویز مشرف نے ایک فوجی بغاوت کے ذریعے اقتدار پر تسلط حاصل کیا تو انہیں اتحاد بنانے کیلئے MQM کی ضرورت پڑی۔ لہذا انہوں نے اسے دوبارہ کھڑا کردیا، اسے حکومت میں شامل کیا، اوراس کو پہلے سے زیادہ مؤثر اور ظالم جنگجو ونگ کی صورت میں بحال کر دیا۔ تشکیل نو کے بعد، MQM نے بدلہ لینا شروع کیا۔ 1990 کے حملے میں شامل تقریباً ہر تھانے کے دفتر کے سربراہ کو، اکثر دن دہاڑے، اور پیشہ ور قاتلوں کے ذریعے ہلاک کیا گیا۔آج کی تاریخ تک باون کا قتل ہوچکا ہے اور ان میں سے ایک کو تو اپریل 2012 میں میرے دورے سے عین قبل ہی ہلاک کیا گیا تھا۔

شناخت ظاہر نہ کرنے کی شرط پر ایک سینئر اخبار کے مدیر نے بتایا، "وہ ان چیزوں کو بھولتے نہیں ہیں۔" انہوں نے مزید کہا "ہم MQM کے بارے میں لکھے گئے ہر لفظ، ہر جملے کی قدر پیمائی کرتے ہیں۔ میں یہاں کام کرنے والے 150 صحافیوں کا ذمہ دار ہوں۔ اسٹوری میں کوئی ذیلی سطر دیے جانے پر مجھے محتاط رہنا ہوتا ہے۔ مجھے رپورٹر کے مزاج کو دیکھنا ہوتا ہے کیونکہ اسے غیض و غضب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ MQM اس ملک میں سب سے زیادہ منظم جنگجو گروپ ہے۔" وہ ایک ایسی جگہ کیلئے ایک مضبوط بیان ہے جو لشکر طیبہ، لشکر جھنگوی، تحریک طالبان، اور باقی سارے جنگجو گروپوں کا مسکن ہے۔ مدیر نے بتایا "اگر طالبان آپ کو دھمکی دیتے ہیں تو آپ کم از کم حکام سے مدد طلب کرسکتے ہیں، کیونکہ آئی ایس آئی پچولیے کے طور پر کام کرے گی۔ "لیکن ان لوگوں کے ساتھ؟ بالکل نہیں۔"

یوں تو بہت سارے لوگ پارٹی سے نفرت کرتے ہیں، مگر وہ اس کی عزت بھی کرتے ہیں۔ MQM ملک کی کسی بھی دوسری سیاسی جماعت کے برخلاف ایک اچھے نظام کے بطور، بہت حد تک حماس کی طرح تنظیمی سیلز اور ہائی ٹیک لیاقت کے ساتھ کام کرتا ہے۔ انہوں نے پارک بنوائے ہیں اور ٹریفک کو منظم کرنے کیلئے اوور پاس بنوائے۔ کراچی کی 18 ملین آبادی کو دیکھتے ہوئے یہ نسبتا اعلی درجے کا کام کرتا ہے۔ انہوں نے میڈیا کو کنٹرول کرنے کے نظام کو بھی فروغ دیا ہے۔ کیبل آپریٹر اب ان کے اثر و رسوخ کے دائرے میں ہیں۔ جیو ٹی وی کے ایک ایڈیٹر نے بتایا، "اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ رات کے 8 بجے ہم آفاق کے ساتھ ایک انٹرویو نشر کریں گے، جس سے مراد خود کو حقیقی MQM کہنے والے منقسم مہاجر گروپ کےقائد آفاق احمد ہیں تو، کیبل نشریات بند ہوجائے گی اور رات میں 8.55 پر کیبل سروس دوبارہ شروع ہوگی۔"

آج الطاف حسین لندن میں جلاوطن ہوکر وہیں سے اپنی جماعت پر حکمرانی کرتے ہیں اور ان کی غیر موجودگی صرف ان کی حیثیت کو بڑھاتی ہوئی لگتی ہے۔ بہت سارے لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ اعلیٰ درجے کے مہاجر MQM سے نفرت تو

کرسکتے ہیں لیکن وہ اسی کی تائید کریں گے، کیوں؟ "وہ اقلیتوں کا دفاع کرتے ہیں۔ وہ عورتوں کا دفاع کرتے ہیں۔ وہ بااثر ہیں ۔ PPP تو کچھ بھی نہیں کرتی۔ کراچی کے ایک صحافی اور فلمساز نے جنہوں نے پاکستانی میڈیا پر رپورٹیں تحریر کی ہیں، کہتے ہیں، "وہ کاہل اور بے پرواہ، جاگیرداروں جیسے نظر آتے ہیں۔" اور پھر انہوں نے مزید کہا، "کم از کم آپ MQM سے بات تو کرسکتے ہیں، بھلے ہی وہ آپ کو قتل ہی کیوں نہ کر دیں۔"

مجھے بتایا گیا کہ آپ کو جاکر نائن زیرو دیکھنا چاہیے۔ یہ MQM کے صدر دفاتر کا نام ہے اور یہ حسین کے مسلک نما قد کا ایک پیمانہ ہے۔ نائن زیرو ان کے اس گھر کے ٹیلیفون کے آخری دو نمبر تھے جہاں وہ کراچی میں رہا کرتے تھے۔ حالانکہ نائن زیرو ایک متوسط درجے کے مضافات، عزیز آباد میں ہے اور جب آپ وہاں پہنچیں گے اور سیکیورٹی کی گھیرا بندیوں سے ہوکر گزریں گے تو آپ کو یہ احساس ہوگا کہ آپ کسی آقائے جنگ کے خطے میں داخل ہو رہے ہیں۔ جس دن میں وہاں پہنچی تو وہاں پر ایک سرخ رنگ کا قالین ڈائس سے لے کر نیچے تک قرینے سے ایک سیدھ میں سجائی گئی کرسیوں کے بیچ میں بچھا ہوا تھا۔ ایک تقریب کیلئے برطانوی ہائی کمشنر آنے والے تھے۔ ہاتھ میں ریڈیو پکڑے ہوئے ایک اسکورٹ کے ذریعے میری ملاقات کرائی گئی، اور میرے ڈرائیور کو انتظار کرنے کے لیے ایک کونے میں بھیج دیا گیا۔

حسین کا پوسٹر کمرے کو سلامی دے رہا ہے ۔ ہر چیز صاف ستھری، منظم اور قرینے سے لگی ہوئی ہے۔ جس ترجمان سے میری ملاقات ہو رہی ہے ان کا نام سید فیصل علی سبزواری ہے، جو سندھ میں صوبائی وزیر برائے امور نوجواں ہیں۔ انہوں نے نفیس لباس زیب تن کر رکھاہے: ٹین سوٹ پہنے ہیں، جامنی پھولدار ٹائی لگائے ہوئے ہیں، بال سنوارے ہوئے اور دونوں طرف نیچے کو گرے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کے بارے میں سب سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ پورا پیراگراف بولتے ہیں۔ بغیر رکے ۔ میں ان سے کہتی ہوں کہ ہر کسی کا کہنا ہے کہ MQM نے ولی خان بابر کا قتل کیا ہے ۔ وہ سب سے پہلے مجھے یہ بتاتے ہیں کہ مغرب کے ساتھ ان کے اعلی تعلقات ہیں، اور جس وقت انھوں نے بابر کے قتل کے بارے میں سنا اس وقت وہ ایک ویسٹرن فاؤنڈیشن کے ساتھ میٹنگ میں تھے، اور وہ فوراً ہسپتال گئے تھے۔

اس کے بعد نمبر آتا ہے محتاط طریقے سے باہم پیوست کار دفاع کا۔ اس کی شروعات سابق وزیر داخلہ مرزا سے ہوتی ہے، یہ وہی شخص ہیں جنہوں نے MQM کی سمت انگلی اٹھائی تھی۔ "وہ بڑے دوستانہ مزاج کے تھے اور اب بھی کراچی میں عوامی نیشنل پارٹی کے قائدون کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے، 'طالبان ایک متوازی معیشت چلا رہے ہیں، زر فدیہ، ڈکیتی، اغوا برائے تاوان، اسلحہ سے رقم، منشیات سے رقم حاصل کر رہے ہیں۔' یہی تو وہ سب دھندے ہیں جن میں ANP کے قائدین بھی ڈوبے ہوئے ہیں۔ طالبان کو محتاط طریقے سے ANP (ایک سیکولر پشتون جماعت) اور عواقب کے لحاظ سے پشتونوں کے ساتھ جوڑتے ہوئے سبزواری کہتے ہیں کہ "وہ جرائم میں ساتھ ساتھ ہیں۔"

"ایک آدمی کو نقطوں کو جوڑنا ہوتا ہے۔ ایک ANP کی قیادت ہے جو بدنام ہے، جس نے سیاست کے لبادے میں معاشی، اقتصادی لحاظ سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ایک وزیر داخلہ [مرزا] تھے جو اردو بولنے والی برادری کے خلاف اپنے تبصروں میں ناآشنائی کے خوف میں مبتلا تھے، جب انہوں نے ANP چیف کے گھر پر بات کرتے ہوئے کہا کہ اردو بولنے والے، مہاجرین جو ہندوستان سے پاکستان آئے تھے ننگے اور بھوکے تھے۔ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اور اس ملک نے انہیں سب کچھ دیا ہے۔ یہ ایک ناآشنائی کے خوف پر مبنی تبصرہ تھا۔ یہ ایک نسل پرستانہ تبصرہ تھا۔ اس سے ہمارے

تئیں ان کے اندر کی نفرت ظاہر ہوگئی۔ چونکہ 85 فیصدMQM کا تعلق اردو بولنے والے پس منظر سے ہے لہذا ہم نے اسے سنجیدگی سے لیا۔"

اگلی سانس میں سبزواری 1990 کی دہائی میں MQM کی عدلیہ سے ماورا ہلاکتوں پر بات کرتے ہیں۔ پھر MQM کے مقصد کا مسلہ ہے۔ "MQM پشتونوں کی بیخ کنی کرنا چاہتا ہے۔ کیا واقعی ایسی بات ہے؟ اب کراچی میں سیکڑوں پشتون صحافی مصروف عمل ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ پشتون کیلئے، MQM واحد امید اور کراچی میں سب سے بڑا نمائندہ ہے۔ ...ہم پاکستان میں واحد لبرل جماعت ہیں۔ دوسرے تو نسلی یا خاندانی سیاست کی نمائندگی کرتے ہیں۔" وہ کہتے ہیں "پھر تو MQM کا کوئی محرک نہیں ہے۔ ولی خان بابر کسی سیاسی بیٹ کی کوریج نہیں کر رہے تھے؛ ان کی تو شہری بیٹ اور ثقافت تھی،" سبزواری دعوے کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں حالانکہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ پھر وہ جلدی سے مزید کہتے ہیں، ہاں اس اہم دن کو انہیں ایک کرائم رپورٹر کی حیثیت سے استعمال کیا گیا تھا جہاں ANP جماعت اور PPP کے بیچ زر تاوان کے معاملے پر لڑائی ہو رہی تھی۔" اصل میں، MQM والے بھی برتری کی جنگ میں بری طرح سے ملوث تھے۔

سبزواری ہماری میٹنگ کو ختم کرنے میں محتاط تھے نیز انہوں نے مجھے MQM کی روادارانہ اقدار کی یاد دلائی۔ "MQM لاہور میں احمدیوں کے قتل کے بارے میں تشویشات کا اظہار کرنے والی واحد جماعت ہے۔ MQM واحد ایسی پارٹی ہے جس نے کہا کہ کراچی میں طالبان سازی کا کام ہو رہا ہے۔ میں نے وطن واپسی کے بارے میں پوچھا اور سوات سے پشتونوں کی کثیر تعداد میں نقل مکانی کی جانچ کی اور کیا ہوا؟ اسامہ بن لادن کی بیوہ کراچی میں تھی۔ خالد شیخ محمد یہیں تھے۔ کتنے سارے پشتون انتہا پسند یہاں پر موجود ہیں؟" سبزواری کی تقریر سے جس چیز کا انکشاف ہوا وہ تھی MQM کے فلسفے کے پس پردہ نفسیات؛ پارٹی کے قائدین ایک مخفی عقیدے کو پناہ دیتے ہیں کہ جب تک وہ اس بلاک کے مشکل ترین آدمی نہیں ہوں گے، اگر برتری کی جنگ نہ ہو تو آبادیاتی لحاظ سے ان کا صفایا کردیا جائے گا۔ انہوں نے خود کو خواتین اور اقلیتوں کی مدافعت اور جہادیوں کے خلاف تعینات کیا ہوا ہے۔ یہ ایک درخشندہ، تیز رفتار کارکردگی تھی۔ ادھر ادھر کچھ سچائی بھی تھی۔ لیکن انہوں نے واقعتا کبھی بھی اس حقیقت کی طرف بات نہیں کی کہ مشتبہ لوگوں کا تعلق MQM سے ہے یا یہ کہ MQM پر الزام دھرنے والے گواہوں کو قتل کردیا گیا ہے۔ سبزواری کی نگاہ اپنی گھڑی پر تھی۔ برطانوی ہائی کمشنر آنے ہی والے تھے۔

MQM نے ذہانت کے ساتھ اور مؤثر طریقے سے مغرب کی پناہ لی ہے۔ ایک مشہور اخبار کے مدیر کا کہنا ہے، "انہوں نے مغربی سفارتخانوں کو یہ آئیڈیا بیچنے کا انتظام کرلیا ہےکہ انتہا پسندوں کے خلاف وہ آخری سیکولر موقف ہیں۔ اس بدترین وقت میں جب بڑے بڑے حملے ہو رہے تھے، جنگجوؤں کو برطانیہ اور امریکہ کے ویزے مل گئے۔"

مدیر نے آگے کہا، "اہل مغرب ANP-MQM کی برتری کی جنگ پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ پشتون کراچی آ چکے ہیں۔ جھونپڑوں والی بستیاں بڑی ہو گئی ہیں اور یہیں پر آکر برتری کی جنگ نے عروج حاصل کیا۔ طالبان کو ان اقلیتی بستیوں میں پناہ مل گئی ہے اور پولیس کیلئے وہاں جانا ممکن نہیں ہے۔ امریکی چاہتے ہیں کہ پرتشدد اسلام کو پرتشدد سیکولر نوازوں کے ذریعے ختم کیا جائے اور اگر انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو ہوا کرے۔"

طالبان اور *ڈیسینٹ انٹو کیآوس* کے مصنف اور CPJ کے بورڈ ممبر، احمد راشد کہتے ہیں، "MQM اور برطانوی حکومت کے بیچ ایک طرح کا میثاق ہے۔ MQM اور اس کے قائدین کو برطانیہ میں جس طریقے سے برداشت کیا جاتا ہے اس سے پاکستانی حیرت زدہ اور پریشان ہیں جبکہ وہ کراچی میں اتنے سالوں سے ہونے والی اس قدر ہلاکتوں میں ملوث ہیں۔"
بابر کے کیس میں اصل پروسیکیوٹر، محمد خان بریرو اسے اپنے انداز میں بتاتے ہیں: کینیڈا نے ان پر دہشت گرد تنظیم کا لیبل لگایا۔ اگر دولت مشترکہ والا ملک انہیں دہشت گرد تنظیم کہتا ہے تو پھر برطانیہ اس سے مختلف کیوں ہے؟ اس لیے کہ MQM نے پاکستان میں برطانوی بنیادی ڈھانچے کے تحفظ کا وعدہ کیا ہے۔ کسی بھی فساد میں برطانوی تنظیمیں، چاہے BP ہو یا دوسری ہوں، متاثر نہیں ہوں گی۔ اگرچہ یہ ایک مبالغہ آمیز دعوی ہے، مگر یہ پاکستان میں وسیع پیمانے پر پایا جانے والا مطمح نظر ہے۔

برطانوی حکومت اس قیاس آرائی کو ختم کرنے کی بہت معمولی کوشش کرتی ہے کہ وہ MQM کے رویے سے چشم پوشی کرتی ہے۔ جب میں نے یہ ذکر کیا کہ پاکستانیوں کا ماننا ہے کہ برطانیہ نے MQM کے ساتھ ایک قسم کا میثاق کر رکھا ہے، کہ انہوں نے کراچی میں جنگجوئیت چلانے کے ملزموں کو تحفظ دے رکھا ہے تو، سفارتخانے کے ترجمان جوناتھن ولیمز نے کہاکہ برطانیہ کیMQM کے ساتھ شمولیت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ یہ جمہوری طور پر منتخبہ جماعت ہے۔ ولیمز نے بتایا، جہاں تک مخصوص معاملات، جیسے MQM کے قائد حسین کی پناہ یا انگلینڈ میں توسیعی ویزا حاصل کرنے کی بات ہے تو، "ہم خاص طور پر پناہ گزینی یا ویزا کے انفرادی معاملات پر تبصرہ نہیں کرتے ہیں۔ انہوں نے معذرت کرلی اور اس چیز کو انہوں نے اپنے جواب کی محدود نوعیت بتایا۔

آج MQM آبادیاتی مدافعت پر ہے، اور جزوی طور پر اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے چند سال تشدد سے بھرے رہے ہیں۔ 1998 کی حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق، مہاجرین کراچی کی آبادی کا 48 فیصد تھے، جبکہ پشتون تقریبا 11 فیصد تک پہنچتے تھے۔ 2005 میں آئے زلزلے اور قبائلی علاقوں و خیبر پختونخواہ صوبے میں پاکستانی فوج کے مسلسل آپریشنوں کے بعد سے، پشتون خاصی تعداد میں نقل مکانی کرکے کراچی آگئے ہیں اور انہوں نے اس شرح کو غیر متوازن کردیا ہے۔ تخمینے بتاتے ہیں کہ پشتون اب آبادی کا 20 فیصد سے زیادہ حصہ ہوگئے ہیں۔

کراچی میں ہر سال ہونے والی سیکڑوں ریکارڈ ہلاکتیں اتفاقی نہیں ہیں۔ ANP کی بنیاد 1986 میں پشتون لیڈر عبد الغفار خان کے عدم تشدد کے اصولوں پر رکھی گئی تھی، وہ ایک پشتون لیڈر تھے جو 1890 سے 1988 تک زندہ رہے، انہوں نے پہلے برطانیہ کے خلاف پھر پاکستان حکومت کے خلاف تحریک کی قیادت کی۔ لیکن اب ANP کراچی MQM کے حربوں کو اختیار کر رہی ہے اور اس نے ایک جنگجو شاخ بنائی ہے۔ اس نے منقسم MQM گروہ — MQM حقیقی یا اصل MQM — کے ساتھ اور ایک بلوچ تنظیم پیوپل آف امن کمیٹی کے ساتھ اتحاد کیا ہے۔ گروہ بندی، منقسم گروپ، اور عارضی اتحاد ایک ایسی گتھی ہے کہ اس کو سمجھنے میں دماغ چکرا جاتا ہے اور انہوں نے کراچی کے علاقوں کو خونیں گروہوں کی سرزمین میں تبدیل کردیا ہے۔ خود مختار حقوق انسانی کمیشن برائے پاکستان کے مطابق، 2012 کے صرف نصف اول میں ہی 972 افراد کو باقاعدہ نشانہ بنا کر ہلاک کیا گیا ہے۔

ایک نیوز منیجر کا کہنا ہے، "ANP کے مقامی لیڈروں نے پرتشدد اور مافیا دوست لیڈروں کو زیادہ اور سیاست کو کم بڑھاوا دیا۔ ہمیں کراچی میں زیادہ تشدد اور میڈیا پر زیادہ دباؤ پڑتا نظر آئے گا۔" ان کا کہنا تھا، "حال ہی میں، وہ نیوز

روم میں اس وجہ سے چیخ رہے تھے کہ ان کے صحافی بلیٹ کو روکنے والی جیکٹ نہیں پہنے ہوئے تھے۔ لیاری میں ہوئے فساد کے بعد گھر واپس جانے والے صحافیوں کو ایک طرف تو MQM نے تو دوسری طرف ANP نے روکا ۔ "یہ سنگین معاملہ ہے۔ اگر بات کارکنان کے کانوں تک جاتی ہے کہ صحافیوں کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے، تو کوئی بھی گولی چلا سکتا ہے۔"

ANP نے MQM کی طرح ہی، کیبل کاٹنے کا بھی ڈھنگ نکالا ہے۔ کبھی کبھی کیبل کی لڑائی ایسی نظر آتی ہے جیسے بچے کھیل کے میدان میں کسی کھلونے پر جھگڑ رہے ہوں۔ جب ANP کے صوبائی سربراہ، شاہی سید سینیٹر بنے اور واپس کراچی پہنچے تو وہ جیو ٹی وی سے اپنی آمد کی مکمل کوریج کی توقع کر رہے تھے۔ ANP آخرکار MQM حقیقی کے ساتھ اتحاد کا اعلان کر رہی تھی۔ لیکن اسی دن بنگلہ دیش اورپاکستان کےبیچ کرکٹ کا فائنل تھا، اورجیو نے وہی پروگرام چلایا جس سے زیادہ ناظرین ملیں گے: یعنی کرکٹ۔ اگلے دن جیو ٹی وی پر دھمکیوں کا سیلاب آگیا۔ ANP نے اسٹیشن کے کیبل کاٹ دیے ، اور اس کی اساسی کمپنی جنگ گروپ کیلئے اخبارات لے کر آنے والے ٹرکوں کو جلا دیا۔ جیو نے ANP کے لیڈروں کو فون کیا، جو اسٹیشن کے دفاتر میں ایک پیغام لے کر آئے۔ "انہوں نے ہمیں بتایا، 'ہم جانتے ہیں کہ آپ کے بچے اسکول جاتے ہیں۔ ہر کوئی مضافات میں آتا جاتا ہے، اور کوئی بھی ولی خان بابر بننا نہیں چاہتا ۔ لیکن اس شہر میں یہ چیزیں ہوتی ہیں۔' ایک صحافی نے یاد کرتے ہوئے بتایا، ' یہ ایک براہ راست دھمکی تھی۔" ANP کے اہلکاروں نے تبصرے کی درخواست کا جواب نہیں دیا۔

اسی وجہ سے کراچی میں ہر کوئی آپ کو بتائے گا کہ تشدد کا ایک طریقہ ہے۔ یہ اتفاق نہیں ہے۔ اگر آپ اپنے حریفوں کو نسلی لحاظ سے کسی متنوع علاقے میں ہلاک کرتے ہیں تو وہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، آپ انتخابات جیت لیتے ہیں، اور آپ زر تاوان کی مزید رقم اینٹھ لیتے ہیں۔ ایک منیجنگ ڈائرکٹر نے قیاس لگایا کہ ہوسکتا ہے کہ اسی چیز نے ولی خان بابر کو ہلاک کردیا ہو۔ "خود مجھےیہ محسوس ہوتا ہے کہ MQM کا خیال تھا کہ اگر کوئی پشتون کراچی میں ایک صحافی کی حیثیت سے اس قدر مشہور ہوجاتا ہے تو یہ چیز کراچی میں پشتونوں کو ایک شناخت اور ایک آواز، اور مساوی نمائندگی عطا کردیتی ہے۔" ایک اور مشہور صحافی کا کہنا ہے: " نیوز روم کافی حد تک MQM نواز ہیں، اور اس کا تعلق ان چند لوگوں سے تھا جو واضح طورپر ایک ارتقاء پذیر نسلی گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ معاملے کو واضح کرنے کے لیے یہی کافی ہوسکتا ہے۔"

‘‘اگر پاکستان کے سیاستدان چاہیں تو تشدد کو روکا جا سکتا ہے’’، کراچی کے ایک مدیر کا کہنا تھا، ‘‘لیکن اکثر و بیشتر، سیاسی جوڑ توڑ کے نتیجے میں امن کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں۔ اس جانے والی حکومت کے زیریں یہ تمام سیاسی پارٹیاں اے این پی، پی پی پی، اور ایم کیو ایم آپس میں متحد ہیں۔ تو ایسے میں’’، مدیر نے بتایا، ‘‘اگر پولیس ایم کیو ایم کو گرفتار کرتی ہے، مطلب دوسرے اسلام آباد کو، یعنی زرداری کے آدمیوں کو تو ادھر سے فون آئے گا اور کہا جائے گا کہ ان کو چھوڑ دیا جائے۔’’

حکومت نے پارٹنروں کو صرف متحد ہی نہیں رکھا بلکہ اپنی غلیظ چالوں کے لیے ان کا استعمال بھی کیا ہے۔ جنوری 2012 میں ایسا لگا تھا کہ زرداری کی حکومت میموگیٹ معملے میں برطرف ہو جائے گی۔ پاکستان کے امریکی سفیر حسین حقانی نے امریکی جوائنٹ چیف آف اسٹاف مائکل مولین کو ایک میمورنڈم بھیجا تھا۔ جس میں پاکستانی چیف آف آرمی اشفاق

پرویز کیانی اور اس وقت کے آئی ایس آئی ڈائریکٹر احمد شجا پاشا کو برطرف کرنے کے سلسلے میں مدد مانگی تھی۔ فوج کا ماننا تھا کہ اس کے پیچھے زرداری ہیں۔

جنگ گروپ، بشمول جیو، اور *دی نیوز* زرداری کے ہاتھ پیر کاٹ رہا تھا۔ *دی نیوز* کے سابق مدیر اور ٹی وی کی ایک جانی مانی شخصیت، محمد ملک نے مجھ سے کہا کہ ایک موجودہ وزیر نے جس کا نام وہ نہیں لیں گے، حکومت پر حملے کو روکنے کیلئے انہیں 3 کروڑ روپے (تقریباً US$300,000) کی پیشکش کی تھی۔ "پھر انہوں نے مجھے دھمکانا شروع کیا، مجھ سے کہا کہ میں بہت تیز گاڑی چلاتا ہوں اور جب آپ گاڑی تیز چلاتے ہیں تو حادثات ہوتے ہیں۔" وہ کہتے ہیں، "مجھے اپنے گرد و پیش میں سفید رنگ کی کورولاز نظر آنے لگیں" جس سے ان کی مراد انٹلی جنس ایجنسی کی جاری کردہ علامتی کاریں تھیں۔ انٹلی جنس میں میرے ایک دوست نے میرا فون نگرانی پر لگا دیا۔ ...صدر کے قریبی ایک سینیٹر مجھ سے دوستی گانٹھنے لگے، مجھے شہر سے باہر کے مقامات پر مدعو کیا گیا۔ میں نے کہا کہ اس کا کوئی مطلب نہیں بنتا ہے – سڑکیں محفوظ نہیں ہیں۔ ان کے انٹلی جنس کے ذرائع نے بتایا کہ ملک کو "ٹھیک" کرنے کی بات چیت چل رہی ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہیں ہلاک کرنا ہے۔ "اس بیچ سویلین انٹلی جنس میری کار، میری بیوی کی کار کا تعاقب کرتے ہوئے خود کو سامنے لا رہے تھے۔ میرے بچے لاہور میں پڑھ رہے تھے، اور مشکوک معاملات چل رہے تھے۔ حکومت میں شامل دوست مزاج سویلین نے مجھ سے کہا، "بس نکل جاؤ فوراً نکل جاؤ۔"

جنگ گروپ کے چیف ایکزیکیٹو، شکیل الرحمان نے ملک کے دوبئی چلے جانےکا انتظام کیا۔سابق وزیر داخلہ رحمان ملک کے ساتھ ایک گفتگو یاد کرتے ہوئے ملک کا کہنا ہے، "لیکن یہ ایک پرمزاح حکومت ہے۔ انہوں نے مجھے فون کیا اور کہا، 'میں چار سرحدی کانسٹیبلوں کو آپ کیلئے بھیج رہا ہوں۔' اور میں نے کہا، 'بس ان لوگوں کو واپس بلالیں جنہیں آپ نے میرے اوپر تعینات کر رکھا ہے۔"

ملک کہتے ہیں، سرکاری اداروں کے ذریعے صحافیوں کو روایتی طور پر ہراساں کرنے کا کام عروج پاکر مزید ذاتی ہوگیا ہے۔ ہو یہ رہا ہے کہ ریاست اور افراد کے بیچ کی لکیر نیست و نابود ہوگئی ہے۔ صرف فوجی پہلو سے ہی یہ ادارہ جاتی ایذا رسانی ہے — MI [ملٹری انٹلی جنس] یا ISI ادارہ جاتی ردعمل ہے۔ سویلین پہلو سے، ریاستی فنکشنریز ہی ریاستی وسائل کا اور آپ کو دھمکی دینے کیلئے اپنے گھونسے کا استعمال کر رہی ہیں۔ یہ ایک مافیا ریاست کی طرح ہے۔ آپ کی واحد متبادل ہے عدالت اور عدالتیں غیر متیقن ہیں۔ میڈیا بہرحال کافی طاقتور ہے۔" اور اسی وجہ سے، زیادہ خطرناک بھی ہے۔

مئی 2011 میں *ایشیاء ٹائمز آن لائن* کے رپورٹر شہزاد سلیم کے قتل سے پہلے ہی – ایک برسر عام ہلاکت جس کو وسیع پیمانے پر آئی ایس آئی کے ایجنٹوں کا کارنامہ مانا جاتا ہے – یہ واضح ہوگیا تھا کہ پاکستان میں یہ کھوجی صحافت روسی رؤلیٹ کا ایک کھیل بن گیا ہے۔ صحافیوں کو ہر طرف سے مجبور کیا جاتا ہے، طالبان، لشکر طیبہ، لشکر جھنگوی، آئی ایس آئی، MQM، وفاداران زرداری، اور دیگر ریاستی و غیر ریاستی جنگجوؤں کے میزبان کی جانب سے دھمکی دی جاتی ہے۔ ابھی تک اس دہائی میں مشرف کے نشریاتی میڈیا پر حکومت کی گرفت ختم کرنے کے بعد سے، پاکستان میں صحافت کا پیشہ کبھی بھی اس قدر ارتعاش پذیر نہیں رہا ہے۔ آج 90 سے زیادہ ٹی وی اسٹیشن ہیں، اور 100 سے زیادہ

ریڈیو اسٹیشن ہیں۔ ملک کہتے ہیں، "وہ دن گئے جب اخبارات ایک ادارے کی حیثیت سے فوج پر انگلی اٹھانے سے خوف کھاتے تھے۔ لیکن ہم افراد کے خلاف کوئی موقف اختیار نہیں کرسکتے ہیں کیونکہ ہمیں کوئی ادارہ جاتی تعاون حاصل نہیں ہے۔ کوئی بھی اتنا بڑا نہیں ہے کہ اس کو زیر نہ کیا جاسکے۔ جب تک صحافی کی ہلاکت کیلئے کسی کو ذمہ دار نہیں قرار دیا جاتا یہ نہیں رکے گا۔"

ولی خان بابر کے قتل نے کراچی پریس کلب میں غصے کو بھڑکا دیا۔ صحافی ایک وقت کیلئے آپس میں متحد ہوگئے، حکومتی اقدام کا مطالبہ کرنے لگے۔ لیکن مقدمہ عدالت میں جانے کے بعد اہل خاندان عموما اسے جاری رکھنے کیلئے تنہا رہ گئے۔ جیسا کہ صحافی نجم سیٹھی نے بتایا، پولیس کو کوئی فارنسک تجربہ نہیں ہے اور اس پر اس طرح کے معاملات کو سلیم شہزاد کے قتل کی طرح ہی جاری رکھنے کا داخلی دباؤ ہے۔ وہ کہتے ہیں، اگر زرداری نے بے نظیر بھٹو کے معاملے کو ایک وفاق تفتیشی ایجنسی کی پوری قوت کے ساتھ آگے نہیں بڑھایا ہوتا اور اگر مشرف کو بطور ملزم نامزد نہ کیا گیا ہوتا تو، یہ عدالتی مرحلے تک بھی نہیں پہنچا ہوتا۔" آج کی تاریخ تک، جرنلسٹس یونین نے ساتھی صحافی کی جانب سے عدالت میں عرضی گزار بننے کیلئے خود سے کوئی پیشقدمی نہیں کی ہے۔ بابر کا بھائی ابھی بھی عدالت میں اس معاملے کی پیروی کر رہا ہے اور اس نے جج کے سامنے شہادت دی ہے۔

میں نے کراچی پریس کلب میں بابر کی تفتیش کے بارے میں صحافیوں سے پوچھا۔ وہ مسکرائے اور اپنی اپنی کرسیوں پر تشریف فرما ہوگئے۔ ایک نے کہا، "ہر کوئی MQM کی سمت انگلی اٹھاتا ہے، لیکن پروسیکیوٹرز اور جج صاحبان بھی دھمکی کے زیر اثر ہیں۔"مسلکی ہلاکتوں کے بعد پچھلے دو مہینے میں دس وکیلوں کے قتل کا معاملہ پیش آیا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ جج اور پروسیکیوٹر دھمکی کے زیر اثر ہیں اورپچھلے پروسیکیوٹر امریکہ بھاگ گئے۔"

بالآخر میں نے ان دو پروسیکیوٹروں کو ٹیکساس میں جا لیا، جہاں وہ اس قدر گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ انٹرنیٹ تک بھی انہیں کوئی زیادہ رسائی نہیں تھی۔ وہ دسمبر 2011 میں کراچی سے فرار ہوئے اور ہیوسٹن چلے گئے، جہاں ان کے دوست موجود تھے۔ ان کے پہنچنے کے دس دن بعد، ایک پاکستانی وکیل ، جس نے " ایجنسیوں" کیلئے کام کیا تھا ان کے بارے میں پوچھ تاچھ کرتے ہوئے ہیوسٹن جا پہنچا۔ پروسیکیوٹر بدحواس ہوگئے، انہیں یقین ہوگیا کہ وکیل انہیں کے پیچھے پڑا ہوا ہے، اور انہوں نے ایک چھوٹے سے شہر میں ایک دور دراز کے دوست کو فون کیا۔ پروسیکیوٹروں میں سے ایک، محمد خان بریرو نے مجھے بتایا "ہم نے کہا، 'خدا کے واسطے ہمیں پناہ دو۔ ہم کسی پر بھی اعتبار نہیں کرسکتے ۔"

پروسیکیوٹروں نے کراچی میں پریس کے کافی قریب رہ کر کام کیا تھا۔ بہرحال، یہ شہری کے زیر قیادت نیا پاکستان تھا جہاں معملات کو واضح رکھنے کے تصور میں یقین تھا۔ کراچی کا ان کا تجربہ اس بارے میں بہت کچھ بتاتا ہے کہ پاکستان میں انصاف کیسے کام کرتاہے، اور بریت کو ختم کرنے کیلئے کیا کام کرنا ضروری ہے۔ ان کی کہانی یہ ہے۔

1980 کی دہائی میں سندھ میں پیدا ہونے اور پرورش پانے والے بریرو اور ان کے ساتھی پروسیکیوٹر مبشر مرزا یونیورسٹی کے PPP اسٹوڈنٹ ونگ میں ضیا مخالف شورش والے دنوں میں شامل ہوئے اور انہوں نے پارٹی کو کبھی نہیں چھوڑا۔ 2007 میں، مشرف کے دور میں، معزول چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو بحال کرنے کیلئے پورے ملک میں

چلنے والی وکلاء کی تحریک میں ان دونوں نے ان کے ساتھ سفر کیا ۔ جب بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد PPP نے انتخابات جیتے تو یہ دونوں کراچی کی دہشت گردی مخالف عدالت میں پروسیکیوٹرز کی حیثیت سے بحال ہوئے تھے۔

جلد ہی انہیں عدالت میں ان کی تحقیر کرنے والے اسلامی دہشت گردوں کا محاسبہ کرتے ہوئے، کچھ مشکل ترین معاملات کا سامنا ہوا: "کیا آپ کو اپنی جان کی پرواہ نہیں ہے؟" "آپ اپنے گھروالوں کو مردہ حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں؟" انہوں نے حکومت سے مزید تحفظ کی استدعا کی۔ انہوں نے بدترین صورت حال کے دفاتر میں کام کیا، جہاں نہ کاپی کرنے کی مشینیں تھیں، نہ کمپیوٹر تھے، نہ فون تھے، یہاں تک کہ روشنی کیلئے بلب بھی نہیں تھے، اور یقینی طور پر کسی طرح کی حفاظت کا انتظام نہیں تھا۔ 2010 میں انہوں نے اپنے بوسیدہ دفاتر میں *ٹائم* میگزین کو بلایا اور اس بات کی وضاحت کی کہ حکومت عدالتی توسط کے بجائے فوجی ذرائع – اور اکثر و بیشتر ورائے عدالت ہلاکتوں –کے ذریعے دہشت گردی سے لڑنے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔

اس کے باوجود ، انہوں نے بہت سارے معاملات کے مقدمے چلائے اور کراچی پریس کے ساتھ واضح رشتے بنائے ۔ نیو یارک میں ان کے ساتھ ہونے والی ملاقات میں انہوں نے مجھے بتایا، "ہم نے سبھی صحافیوں کو اپنے اپنے کیمروں کے ساتھ دہشت گردی مخالف عدالتوں میں مدعو کیا۔ ہم سے پہلے، صحافیوں کو ممنوع قرار دے دیا گیا تھا، لیکن ہم بھی جمہوریت کے ساتھ عدلیہ کی بحالی کیلئے سیاسی کارکنان تھے۔"

ان پروسیکیوٹروں کو 2011 میں ایک امتحان سے گزرنا پڑا تھا جس میں وزارت داخلہ کی ماتحتی میں کام کرنے والی پارامیلیٹیری سیکورٹی فورس، پاکستان رینجرز کے چھ ممبروں کے انتہائی شہرت یافتہ قتل کیس کی سماعت کرنی پڑی تھی۔ یہ شاید ان پروسیکیوٹروں کا سب سے کامیاب مقدمہ تھا، لیکن یہ مقدمہ ایسا بھی تھا جس نے ان کے مستقبل کیلئے سنگین نتائج مرتب کیے۔ 8 جون 2011 کو، ایبٹ آباد میں امریکہ کے چھاپے مارنے کے ایک ماہ کے بعد، جس میں اسامہ بن لادن مارا گیا تھا، کراچی میں چھ رینجرز اور ایک غیر مسلح شہری، سید سرفراز شاہ کو کلفٹن کے مضافات میں بے نظیر بھٹو کے نام سے منسوب ایک عوامی پارک میں اپنی زندگی کی دہائی دیتے وقت بہت قریب سے گولی مارتے ہوئے ان کی ویڈیو بنائی گئی تھی۔ اس ویڈیو میں ایک شہری کو رینجرز کے سامنے شاہ کو گھسیٹتے ہوئے دکھایا گیا تھا جس نے بعدمیں انہیں گولی ماردی۔ اس میں ان سبھی کو وہاں کھڑے دکھایا گیا تھا جب شاہ مدد کی بھیک مانگ رہے تھے اور خون بہنے کے بعد بیہوش ہو گئے تھے۔ بعد میں شاہ اپنے زخموں کی تاب نہ لاکر چل بسے۔

یہ ویڈیو پاکستانی ٹیلی ویژن اسٹیشنوں پر نشر ہوا اور وباء کی طرح پھیل گیا، جس سے پورے پاکستان میں چیخ پکار ہونے لگی۔ چیف جسٹس افتخار چودھری نے کہا کہ وہ رات کو سو نہیں سکے۔ انہوں نے رینجرز کے ڈائرکٹر جنرل اور پولیس کے ڈائرکٹر جنرل کو طلب کیا اور انہیں ان کے عہدوں سے ہٹا دیا۔ بریرو نے بتایا، "وہ رینجروں کے خلاف مقدمہ رجسٹر کرنے پر بضد تھے۔" وزیر داخلہ رحمان ملک نے، جن کی وزارت ان رینجروں پر نگاہ رکھتی ہے، ان آدمیوں کا دفاع کرتے ہوئے جلدی سے ایک بیان جاری کردیا کہ نوعمر شاہ مسلح تھا، اس کے پاس پستول تھی اور کسی کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ پکڑا گیا تھا۔

اس کے باوجود بھی یہ معاملہ دہشت گردی مخالف عدالت میں منتقل ہوگیا تھا، اور پروسیکیوٹر جنرل نے یہ معاملہ بریرو اور مرزا کے حوالے کیا۔ اس وقت تک کراچی پریس انصاف کا مطالبہ کرتے ہوئے سڑکوں پر اتر آیا تھا کیونکہ شاہ ایک رفیق

کار، سماء ٹی وی کے کرائم رپورٹر سید سالک شاہ کے بھائی تھے۔ اس سے بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ منظر ویڈیو کی گرفت میں لینے والا شخص بھی ایک صحافی، آواز ٹیلی ویژن کا ایک کیمرا مین عبد السلام سمرو تھا۔ اب وہ دھمکیوں کے سائے میں ہیں اور ان پر اپنا ویڈیو فرضی ہونے کا اعلان کرنےکا دباؤ ڈالا جا رہاہے۔ آواز چھوڑ دینے کیلئے مجبور ہونے کے بعد وہ ایک گھر سے دوسرے گھر چھپتے پھر رہے ہیں۔

اسی دوران، کراچی پریس کلب کے صدر امتیاز فاران نے ان دونوں پروسیکیوٹروں کو اس مقدمے پر گفتگو کرنے کیلئے مدعو کیا۔ بریرو یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں، "صحافی اس بات کے قائل ہوگئے تھے کہ انہیں عدالت سے کبھی انصاف نہیں مل پائے گا، حکومت ان واقعات کا جو رخ پیش کر رہی ہے یہ پروسیکیوٹر کبھی بھی اس کے برخلاف موقف نہیں اپنا سکتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ اگر ہم نے عدالتوں میں یہی کام کیا تو ہمیں خوفناک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

پیش آمدہ معاملے پر بریرو کا رخ یوں تھا: "سید سالک شاہ سماء ٹی وی کیلئے ایک کرائم رپورٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، اور پولیس و رینجروں کی غیر قانونی سرگرمیوں کا پردہ فاش کر رہے تھے ۔ ان سبھی پارکوں میں ایک مخصوص جگہ ہے جہاں آپ اپنی کار کھڑی کرتے ہیں۔" جیسا کہ کراچی والے آپ کو بتائیں گے، یہ پارکنگ کی جگہوں – رینجروں اور سیاسی جماعتوں سمیت – متعدد جابروں کے بیچ منقسم ہیں جو فیس عائد کرکے رقم کماتے ہیں۔ "سالک اس کی تفتیش کرنے اور رپورٹ پیش کرنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ اس کے بھائی سید سرفراز شاہ اس شام کو پارک میں پہنچ گئے جب رینجروں کا ایک ایجنٹ یہ غیر قانونی پارکنگ فیس وصول کر رہا تھا۔ جب شاہ نے ایجنٹ کے ساتھ مداخلت کرتے ہوے یہ پوچھا کہ آپ یہ غیر قانونی فیس کیوں لے رہے ہیں؟ – ایک جھگڑا شروع ہوگیا اور پھر ایجنٹ نے رینجروں کو بلا لیا۔" پروسیکیوٹر نے بتایا کہ شاہ کی جیب میں انہیں اس کے صحافی بھائی کا بزنس کارڈ ملا تھا۔

بریرو کہتے ہیں، رینجروں نے بغیر کسی تنبیہ کے شاہ کو گولی ماری تھی، اور اس وجہ سے فرسٹ ا نفارمیشن رپورٹ درج کی کے ان کے ٹریک ڈھک جائیں۔ رپورٹ میں بیان کیا گیا کہ رینجروں نے شاہ کو "ڈکیتی کرتے ہوئے" – چوری کرتے ہوئے –"اور بغیر کسی لائسنس یا اختیار کے غیر قانونی اسلحہ رکھے" دیکھا تھا ۔

ایک جائنٹ انویسٹیگیشن ٹیم نے، جو شہری اور فوجی انٹلی جنس کی ہستیوں پر مشتمل تھی، اپنی رپورٹ میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رینجر بے گناہ ہیں، شاہ ایک چور تھا، اور اس مقدمے کو عام عدالتوں کے حوالے کیا جانا چاہیے۔ بریرو کہتے ہیں، "مقدمے کے تفتیشی افسر نے صحافیوں کی موجودگی میں یہی رپورٹ جمع کرنے پر دباؤ ڈالا، لیکن میں نے کھلی عدالت میں پوری سختی کے ساتھ اس درخواست کی مخالفت کردی اور یہ خارج کردی گئی تھی۔" پھر انہوں نے کہا کہ ڈائرکٹر انسپکٹر جنرل نے اپنے سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس، اور انسپکٹروں کے ساتھ مجھ سے "اپنے دفتر میں آنے کو کہا اور مجھے دھمکی دی۔ انھوں نے چیخ کر کہا تھا 'تم عدالت میں یہ رپورٹ کیوں نہیں جمع کرواتے ہو؟'۔ میں نے جواب دیا تھا: 'میں یہ رپورٹ کبھی نہیں جمع کراؤں گا کیونکہ مجھے قانون پر عمل کرنا ہے۔ میں آپ کا ماتحت نہیں ہوں۔ یہ رپورٹ اس مقدمے میں شامل رینجروں کو بچانے کیلئے تیار کی گئی ہے'۔ پھر انہوں نے دنیا ٹی وی اور *ڈان* سے تعلق رکھنے والے عدالتی رپورٹروں کو دھمکی دی۔ اور انہوں نے مجھ سے کہا، 'تم زیادہ دن اپنے عہدے پر نہیں رہو گے۔ تم حکومت اور ایجنسیوں کے خلاف چل رہے ہو لہذا محتاط رہنا ورنہ تمہیں مستقبل میں سنگین نتیجوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

بریرو نے بس اپنا کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اس قتل کی فلم بندی کرنے والے سمرو سمیت، 20 گواہوں سے پوچھ تاچھ کی۔ بریرو نے وہ ویڈیو کھلی عدالت میں پیش کیا۔ انہوں نے مدعا علیہ کے گواہ، آئی ایس آئی کے ایک کرنل سے جرح کی۔ پروسیکیوٹروں نے فون پر گمنام دھمکیوں کی پرواہ نہیں کی: انہوں نے مقدمے کو مستقل عدالتوں میں جانے دینے کیلئے، جہاں یہ دھندلا پڑجائے گا، رشوتوں کو ٹھکرا دیا۔ سیکیورٹی عملہ خاص طور پر اس وجہ سے غضبناک تھا کہ دہشت گردی مخالف عدالت میں بے خبر لوگوں کا ٹرائل ہو رہا تھا۔ بریرو کہتے ہیں، "مقدمے کی کارروائی کے دوران مجھے بحریہ کی ایجنسیوں کے ذریعے دھمکی دی گئی۔ مجھے آئی ایس آئی کے ذریعے دھمکایا گیا۔"ہدایت کے مطابق مقدمے میں شہادت کو نقصان نہ پہنچانے کے مدنظر پروسیکیوٹروں کی شدید نکتہ چینی کی گئی۔

سال 2011 فوجی اہلکاروں کیلئے ایک برا سال تھا۔ انہوں نہ صرف امریکہ کی جانب سے بلکہ پاکستانی عوام کی جانب سے بھی جھگڑا مول لے لیا تھا، نظروں میں آئے بغیر حملہ کرنے اور اسامہ بن لادن کو ہلاک کرنے کی ایک غیر ملکی فوج کی اہلیت نے ان کی لیاقت پر سوال کھڑے کر دیے۔ ایبٹ آباد کے سانحے میںPPP کے ساتھ الحاق رکھنے والے شہری پروسیکیوٹروں کے سامنے وردی میں ملبوس افسروں کا ٹرائل میں پیش کیا جانا تو حد ہی ہوگئی تھی۔ یہ غیرت کی بات تھی۔

دہشت، آئی ایس آئی کی دھمکیوں، اور وزیر داخلہ کے ذریعے رینجروں کی بے گناہی کے اعلان کے باوجود، پروسیکیوٹر مقدمہ جیت گئے۔ جج نے ایک رینجر کو موت کی سزا سنائی اور، شاہ کو گھسیٹ کر رینجروں کے سامنے ڈالنے والے شہری سمیت دوسروں کو عمر قید کی سزا سنائی۔ اسی وقت سے حکومت اور ایجنسیوں نے بریرو اور مرزا پر دباؤ بڑھا دیا۔

2013 میں گزرنے سے پہلے، *دی نیوز* کی ایڈیٹر عائشہ ہارون نے کہا، "فوج اور ایجنسی کا ماننا ہے کہ دہشت گردی مخالف کوئی بھی گفتگو سویلین حکومت کے ساتھ نہیں بلکہ ان کے ساتھ ہونی چاہیے۔ یہ شہری حکومت کا استحکام ہی ہے کہ ہمارے پاس پبلک پروسیکیوٹر موجود تھے جو ایک آزاد میڈیا کے ساتھ مل کر رینجر جیسے مقدمات کی پیروی کر سکے اور ان کیسوں کو آگے بڑھانے میں ان کی حمایت کی۔ لیکن پھر ہمارے یہاں دباؤ بھی ہے جس کا ماخذ فوج اور اسٹیبلشمنٹ ہے۔ یہ جنگ ہمیشہ چلتی رہتی ہے، لیکن بتدریج یہ درست سمت میں جا رہی ہے۔ آخر وہ رینجروں پر مقدمہ چلانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔"

اس مقدمے کا اختتام 12 اگست 2011 کو ہوا۔ دفاع نے اپیل کی۔ اور 17 اگست کو بریرو اور مرزا حکومت پاکستان کی اجازت سے امریکہ کیلئے پرواز کرگئے۔ دہشت گردی مخالف عدالت میں پروسیکیوٹروں کی حیثیت سے، انہیں کراچی میں واقع امریکی قونصلیٹ کے ذریعے نیو پورٹ، آر۔ آئی۔ نیول اسٹیشن میں ڈیفنس انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل لیگل اسٹڈیز کی جانب سے منعقدہ ایک پروگرام میں شرکت کیلئے منتخب کیا گیا تھا۔ یہ کورس کیری لیوگر ایکٹ کی تربیت اور لیاقت سازی کے اصولوں کے تحت آیا تھا؛ پاکستان اس میں فوج اور انٹلی جنس کے افسروں کو بھی بھیجتے ہیں۔ بریرو کہتے ہیں، امریکہ میں بھی ان پر پاکستانی فوجی افسروں کا دباؤ پڑا کہ رینجر والے مقدمے کی بابت کوئی بریفنگ نہ دیں کیونکہ اس سے "پاکستان کی بے عزتی ہوگی اور اس کی ساکھ کو زبردست نقصان پہنچے گا۔" اس کے باوجود انھوں نے بریفنگ دی۔

صحافیوں اور عدلیہ کے اہلکاروں کے ساتھ بیشتر جسمانی اور نفسیاتی دہشت کو اس مطمح نظر سے سر کے بل گرایا جاتا ہے کہ وہ یا تو پاکستان کے مفادات کے خلاف امریکہ کے ساتھ کام کر رہے ہیں یا آئی ایس آئی کے جہادی نیٹ ورک کا

پردہ فاش کر رہے ہیں۔ بریرو اور مرزا کا تجربہ اس سے کوئی الگ نہیں تھا۔ پروسیکیوٹروں کی کراچی واپسی کے بعد، ایجنسیوں نے ان کو تنگ کرنا شروع کر دیا ۔ بریرو نے بتایا، "کراچی بار ایسوسی ایشن میں آئی ایس آئی کے افسران نے بارہا ہم سے پوچھ تاچھ کی: 'ہم تربیت کیلئے امریکہ کیوں گئے تھے؟ کس قسم کی تربیت تھی؟ ہم نے امریکہ میں رینجر مقدمے کے بارے میں بریفنگ کیوں دی؟ آپ کو کیوں مدعو کیا گیا تھا؟ دوسرے سبھی افراد دوسرے ملکوں کے وردی پوش تھے۔"

بریرو اور مرزا فوج اور انٹلی جنس کیلئے مصیبت تھے۔ انہوں نے جہادیوں اور ایجنسیوں کے بیچ رشتے کو سمجھ لیا تھا اور انہیں پتہ چل گیا کہ دہشت گردوں کا محاسبہ کرنے میں اس ادارے کی عدم دلچسپی کی کیا وجہ تھی۔
بریرو نے کہا، "ایجنسیاں دہشت گرد لوگوں کو سزا دلوانے میں دلچسپی نہیں رکھتی ہیں۔"

ہر ہفتے آئی ایس آئی اور ایم آئی کے افسروں دہشت گردی کے معاملات پر گفتگو کرنے کیلئے پروسیکیوٹروں سے ملاقات کریں گے، یہ پتہ کرنے کیلئے کہ کتنوں پر مقدمہ چلا ہے، کتنے زیر التواء ہیں۔ "اور وہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں، 'آپ شریف مسلمانوں کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟' یا ' اکرم لاہوری [لشکر جھنگوی کے لیڈر] کے خلاف کیا مقدمہ ہے؟ وہ اسلام کیلئے کام کر رہے ہیں۔ آپ ان کے خلاف کام کیوں کر رہے ہیں؟' ہم نے انہیں جواب دیا کہ حکومت نے یہ مقدمہ ہمارے سپرد کیا ہے۔ *انہیں* اسے واپس لینا چاہیے۔"

MQM تھوڑا سا زیادہ مبہم انداز سے پیش آتا ہے لیکن اتنا بھی زیادہ نہیں ۔ بریرو اور مرزا نے کراچی واپس آتے ہی، ولی خان بابر کے مقدمے پر کام کرنا شروع کردیا۔

بریرو کا ماننا ہے کہ بابر کی رپورٹنگ نے اسے مصیبت میں ڈالا تھا – جیسے زر فدیہ،ابدافی ہلاکتیں، بجلی کی چوری، زمین پر قبضہ، فسادات کی کوریج۔ بریرو کہتے ہیں، "مثلا گلستان جوہر کے علاقے میں جہاں MQM کا غلبہ ہے، لوگ بغیر میٹر کے بجلی کا استعمال کر رہے تھے، بجلی کمپنی کو بل کی ادائیگی نہیں کر رہے تھے، اور MQM فیس لگا کر خود اپنے طور پر رقم وصول کر رہا تھا۔ جب اس اسٹوری کی رپورٹنگ ہوئی اور اسے نشر کیا گیا تو MQM نے ولی خان بابر کو دھمکی دی۔ اپنے آخری دنوں میں اس نے MQM اور PPP کے بیچ زمین پر قبضہ کرنے کے مسئلے کے اوپر پہلوان گوتھ میں چل رہی پرانی دشمنی پر ایک رپورٹ پیش کی تھی۔ تفتیش سے یہ انکشاف ہوا کہ MQM کئی بار ولی خان بابر کو قتل کرنے کی کوشش کر چکا ہے۔"

جیسے ہی بریرو کو یہ مقدمہ سونپا گیا، انہیں گمنام دھمکی آمیز فون آنا شروع ہو گئے۔ پھر بھی انہوں نے پوری طرح سے مقدمے کا مطالعہ کیا۔ "میں اس نتیجے پر پہنچا کہ پولیس نے مناسب ڈھنگ سے مقدمے کی تفتیش نہیں کی تھی۔ اگر کوئی مجرم یامدعا علیہ کسی پوچھ تاچھ میں پولیس کے سامنے بیان دیتا ہے تو وہ بیان قانون کی عدالت کے سامنے قابل قبول نہیں ہوتا ۔ اسے عدالتی مجسٹریٹ کے سامنے بیان دینا ہوتا ہے۔ پولیس نے پورے مقدمے کی خلاف ورزی کی اور کارروائی کو نقصان پہنچایا۔

کچھ حد تک، بریرو ان پر الزام قرار نہیں دیتے ہیں۔ پولیس افسران ڈرے ہوئے ہیں۔ ایم کیو ایم کے خلاف 1990s کے لڑائی میں حصہ لینے والے تقریباً سبھی افراد کو انتقامی کارروائی کے تحت قتل کیا جا چکا ہے۔ ایم کیو ایم ہیڈ کوارٹر پر وزیر داخلہ رحمٰن ملک اکثر و بیشتر جاتے تھے اور الطاف حسین کے تو وہ کھلے ہوئے مداح تھے۔ یہ پیغام ناگزیر طور پر پوری پولیس برادری تک پہنچتا ہے۔ جو لوگ دوسرا کام کرنا چاہتے ہیں انہیں روک دیا جاتا ہے، یا بابر کے مقدمے کی چھان بین کرنے والے کانسٹبل کے معاملے کی طرح، ہلاک کردیا جاتا ہے۔

اس کے باوجود بریرو نے یہ پتہ کرنے کیلئے تفتیشی آفیسر کو طلب کیا کہ انہوں نے اس مقدمے میں اس قدر قانونی خلاء کیوں چھوڑی گئی ہیں۔ بریرو کہتے ہیں، "یہ بہت ہی کمزور ہے۔ دہشت گردی کی تفتیش کرنے والے سبھی [افسر] زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں، ان کی لیاقت کم ہے، وہ قانون کو اچھی طرح سے نہیں جانتے ہیں۔" ان افسران کو درپیش رکاوٹیں دو گنی ہیں۔ ایک طرف تو عملی دشواریاں ہیں جیسے فوجداری انصاف کی مکمل تربیت نہ ہونا، فارنسکس کیلئے ناکافی فنڈنگ، ناقص سیکیورٹی۔ اور پھر طاقتور سیاست بھی کارفرما ہے: وہ گروپ سویلین حکومت کے بازو مروڑ دیتے ہیں جن کے ساتھ انہوں نے اتحاد قائم کیا ہوا ہے، جیسے مذہبی جماعتیں، جو جہادیوں کی پشت پناہی کرتی ہیں، یا MQM، جس کی خود اپنی جنگجو شاخ ہے۔

بریرو کہتے ہیں، "جب میں نے کیس کی مشیت کے بارے میں تفتیشی افسر سے پوچھ تاچھ کی تو وہ ڈھنگ سے جواب دینے پر مزاحم تھا۔ لہذا، ورائے اندراج اس نے مجھے بتایا، 'میں مجبور ہوں۔' اب ہم ایک دھمکی کے زیر اثر ہیں کیونکہ دہشت گردی مخالف ایکٹ کے تحت ہم پروسیکیوٹروں کو گواہ کے بطور کسی بھی ایسے شخص کو طلب کرنے کا اختیار نہیں ہے جسے ہم ٹھیک اور مناسب سمجھتے ہیں۔ دہشت گردی مخالف عدالت کے مطابق، اگر کوئی [افسر] ناقص تفتیش انجام دیتا ہے تو، وہ عدالت کے ذریعے ملزم قرار دیے جانے کا قصوروار ہے۔"

اس پر ستم ظریفی یہ کہ پروسیکیوٹروں کو MQM کے "مخبروں" کے ذریعے خطرے کی تنبیہ کی گئی تھی۔ بریرو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں، "دہشت گردی مخالف عدالت کے کلرکوں نے ہمیں بتایا، 'اگر آپ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو براہ کرم اس مقدمے کو ہاتھ نہ لگائیں۔ خدا کے واسطے، اگر آپ اپنے اہل خاندان کو دیکھنا چاہتے ہیں تو، اس مقدمے کو ہاتھ نہ لگائیں۔ عدالت کی ہر کاپی نائن زیرو کو بھیجی جاتی ہے۔'" جج صاحبان اور پروسیکیوٹر اس بات کو سمجھتے ہیں کہ عدالتوں میں ہونے والی ہرایک کارروائی کی رپورٹ MQM کو دی جاتی ہے۔ یہ دہشت پیدا کرنے کی ایک اور شکل ہے۔ MQM کیلئے ادارہ جاتی تحفظ کو اولیت حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ حقوق انسانی کے ایک وکیل نے مجھے بتایا: "آئی ایس آئی مکارانہ طور پر MQM کی تائید کرتی ہے۔ ولی خان بابر کا قتل ہوجانے کے بعد، MQM نے اپنے رسوخ آئی ایس آئی کے ساتھ بنا لیے ہیں۔ MQM نے پوری پولیس کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ اس نے کراچی میں واقع اداروں میں گھس پیٹھ بنا لی ہے۔ ان کے پاس ایک قسم کے ذہن نشین کرنے والے خوف کی طاقت ہے۔ جن لوگوں کو اس مقدمے میں ملزم قرار دیا گیا ہے ان کا ٹرائل ہوگا اور یہ کہہ کر بری کر دیا جائے گا کہ کافی ثبوت نہیں ہے۔"

یہ چیز بریرو اور مرزا کے امریکہ سے واپس آنے کے چند ہفتوں بعد ہی ان پر فائرنگ کیے جانے کی ایک وجہ ہوسکتی ہے۔ بریرو نے مجھے بتایا، "جب ہمیں ہٹایا گیا تھا تو، ہم یہ پتہ کرنے کیلئے سندھ کے پروسیکیوٹر جنرل کے پاس پہنچے کہ بغیر سماعت کے ہماری مذمت کیوں کی گئی تھی، بغیر کسی جواز کے ہمیں کیوں لوٹا دیا گیا تھا۔ انہوں نے ہم سے کہا، 'اپنے منہ بند رکھیں۔ یہی آپ کیلئے بہتر ہے۔'" بریرو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں، ایجنسیاں صرف بریرو اور مرزا کو ہی نہیں بلکہ ان

کے اہل خانہ کو بھی دھمکی دے رہی تھیں۔ "ہم پر ذہنی تناؤ ڈالنے کیلئے" بچوں سے پوچھ تاچھ کی گئی تھی۔ بریرو تحفظ کیلئے عدالتی نظام پر نگاہیں جمائے رہے، لیکن یہ خام خیالی تھی۔ جب یہ دونوں افراد بار ایسوسی ایشن میں اپیل درج کروانے کو تیار ہوئے تو، ان کے سینئروں نے انہیں معاملہ ختم کردینے کو کہا۔ جب گنوا نے کیلئے کچھ نہیں باقی بچا تب بریرو، مرزا، اور ان کے ساتھیوں نے ایک نیوز کانفرنس بلائی۔ انہوں نے ایجنسیوں کے خلاف منھ کھولا اور خود ان کا تحفظ کرنے میں ناکام رہنے کیلئے PPP حکومت کو مورد الزام قرار دیا۔

اس سے یہ لگا کہ معاملات مزید بگڑ گئے ہیں۔ آئی ایس آئی نے انہیں سندھ انٹلی جنس کے سربراہ کے دفاتر میں 22 دسمبر 2011 کو دوپہر کے وقت حاضر ہونےکا فرمان جاری کیا۔ پروسیکیوٹر سراسیمہ تھے اور انہوں نے اپنے صحافی دوستوں سے مشورہ طلب کیا۔ "انہوں نے ہمیں بتایا، 'وہ آپ کو خود اپنا ہی ایجنٹ بنانے کی کوشش کریں گے۔ اگر آپ نے انکار کیا تو وہ آپ کو نقصان پہنچائیں گے۔ پاکستان میں بہت سارے افراد کا پراسرار طریقے سے قتل کر دیا گیا ہے، بہت سارے لوگوں کو ایجنسیوں نے یرغمال بنا لیا ہے۔ بریرو کہتے ہیں، 'انہوں نے ہمیں فوری طور پر ملک چھوڑ دینے کو کہا۔"

22 دسمبر کو صبح 6 بجے انہوں نے کراچی چھوڑا اور امریکہ کیلئے روانہ ہوگئے۔ آج ولی خان بابر کے مقدمے - اور ایک نئے قتل کے مقدمے میں ایک نیا پروسیکیوٹر بحال ہوگیا ہے۔ 11 نومبر 2012 کو، موٹرسائیکل پر سورا دو بندوق برداروں نے اس مقدمے کے واحد باقی بچے گواہ حیدر علی کو کراچی کے سولجر بازار کے علاقے میں اس کے گھر کے قریب قتل کردیا۔ وہ دو دن بعد عدالت میں گواہی دینے والا تھا۔ اسے انڈر گراؤنڈ ہونا تھا اور اس کا تحفظ بھی ہونا چاہئے تھا ۔نئے پروسیکیوٹر عبد المعروف نے صحافیوں سے شکایت کی کہ پولیس نے مناسب تحفظ فراہم نہیں کیا اور مجرمانہ نیٹ ورک اس قدر طاقتور ہیں کہ گواہی دینے سے ایک دن پہلے گواہ کا خاتمہ کردینا ان کیلئے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

لفظ بہ لفظ: دھمکیاں، وعدے، اور خوف

"اس سرزمین پر پولیس کے نیم دلی سے کیے گئے اقدامات یا اعلی افسروں کی جانب سے ادا کردہ تعزیتی الفاظ سے *دی نیوز* کے صحافی عمر چیما کے تئیں بہیمانہ برتاؤ کی تلافی نہیں ہوگی۔"
--ستمبر 2010 میں چیما کے اغوا اور انہیں زد و کوب کیے جانے کی مذمت کرتے ہوئے اخبار *ڈان* کا اداریہ۔ اس حملے میں انٹلی جنس ایجنٹوں پر شبہہ ظاہر کیا گیا تھا۔ کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔

"موت کا یہ مکرر انداز اس بالکل بنیادی حق کا صریحی انکار ہے کہ ریاست کی حفاظت ایک عائد شدہ ذمہ داری ہے۔ قانون کا نفاذ کرنے والی ایجنسیوں کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ محض لاشوں اور زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا جائے اور ہائی سیکیورٹی الرٹ ہونے کا دعوی کیا جائے۔"
--صحافی ولی خان بابرکے قتل اور کراچی میں ابدافی ہلاکتوں کی رنگ رلیوں کی مذمت کرتے ہوئے حیومن رآئٹس کمیشن آف پاکستان کا جنوری 2011 کا ایک بیان۔

"... میں عدنان کے درج ذیل بیان کو موت کی دھمکی مانتا ہوں۔ انہوں نے کہا: 'سلیم میں آپ کو ایک مشورہ دیتاہوں - ہم نے حال ہی میں ایک دہشت گرد کو گرفتار کیا ہے اور پوچھ تاچھ کے دوران اس سے ڈھیر ساری معلومات، ڈائریاں اور دیگر مواد دریافت کیا ہے۔ اس کے پاس ایک ہٹ لسٹ ہے۔ اگر مجھے اس فہرست میں آپ کا نام ملا تو میں آپ کو بتا دوں گا۔"
--رپورٹر سلیم شہزاد اپنے ایڈیٹر کے نام اکتوبر 2010 کے ایک ای میل میں، جس میں وہ آئی ایس آئی کے دفتر میں ریئر ایڈمرل عدنان نظیرکے ساتھ ہونے والی ملاقات کو ضبط تحریر کر رہے تھے۔ شہزاد نے اپنے ایڈیٹر سے یہ نوٹ "اگر مستقبل میں میرے ساتھ کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو ایک ریکارڈ کے بطور" سنبھال کر رکھنے کو کہا ۔

"تمام تر سنگینیوں کے ساتھ، بدمعاشوں کی نشاندہی کرنے کیلئے ہونے والی اس پوچھ تاچھ کی ناکامی مستقبل میں اس طرح کے 'پراسرار' واقعات کو حل کرنے کے ہمارے عدالتی نظام کی اہلیت کے بارے میں ایک بڑے سوال کو جنم دیتی ہے۔"
--مئی 2011 میں سلیم شہزاد کے قتل کے معاملے میں باضابطہ انکوائری کمیشن کی رپورٹ۔

"صدر زرداری کو یہ امر یقینی بنانے کو ترجیح دینا ضروری ہے کہ پاکستان کے کھوج بین کرنے والے پریس کو زندہ رہنے کی خاطر حساس معاملات کے کوریج سے باز رہنے پر مجبور نہیں کیا جاتاہے۔"
CPJ کے چیئرمین پال اسٹیجر، صدر کے ساتھ مئی 2011 کو ایک ملاقات کے بعد۔ اس میٹنگ میں زرداری نے ملک کے بریت کے ریکارڈ کو تہہ و بالا کردینے کا وعدہ کیا۔

"صحافیوں کا تحفظ میرے مینڈیٹ میں موجود ہے۔"
--مئی 2011 میں CPJ کے وفد سے بات کرتے ہوئے، زرداری۔

"تم ہیرو بننا چاہتے ہیں؟ ہم تمہیں ہیرو بنائیں گے۔ ہم تمہاری ایک مثال قائم کرنے والے ہیں۔"

-- وقار کیانی، برطانیہ کے *گارڈین* کے نامہ نگار، حملہ آوروں کے الفاظ یاد کرتے ہوئے جنہوں نے جون 2011 میں 15 گھنٹے تک انہیں زد و کوب کیاتھا۔ کیانی نے حال ہی میں ایسے آدمیوں کے ذریعے اغوا اور اذیت رسانی کے معاملات پر رپورٹ پیش کی ہے جن پر انٹلی جنس ایجنٹس ہونے کاشبہ ہے۔

"مجھے کیا کرنا چاہیے؟ بس محفوظ رہنے کیلئے اس چیز کی اطلاع نہ دوں جو مجھے معلوم ہے؟"
--ایک پاکستانی صحافی، اکتوبر 2011 میں شائع ہونے والے ایک مضمون کیلئے CPJ کے ساتھ ایک انٹرویو میں۔ شناخت ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بات کرنے والا وہ صحافی آخر کار ملک چھوڑ کر چلا گیا۔

"آج سے ہمارا اعلان یہ ہے کہ وائس آف امریکہ کے سبھی رپورٹر ہمارے نشانے پر ہیں اور انہیں استعفی دے دینا چاہیے۔ بصورت دیگر ہم انہیں مار ڈالیں گے۔"
--طالبان ترجمان مکرم خراسانی جنوری 2012 میں VOA کے رپورٹر مکرم خان عاطف کے قتل کے بعد بلومبرگ نیوز سے بات کرتے ہوئے۔

"پچھلے 10 سالوں میں، پاکستانی صحافی تقریبا ہر مہینے میں اپنے مقتول ساتھی کی موت کی برسی مناتے آ رہے ہیں۔"
--مشہور صحافی مظہر عباس، بابر کے قتل کی برسی پر *دی نیوز* میں جنوری 2012 میں تبصرہ کرتے ہوئے۔

"پاکستان ایک ایسا ملک بن گیا ہے جہاں بے ایمان مامونیت کا مزہ لیتاہے اور قاتل بریت کا مزہ اٹھاتا ہے۔"
--عمر چیما صحافیوں کے قتل کے معاملات میں بریت سے مقابلہ آراء ہونے کے یونیسکو کے منصوبے پر پاکستان کی مخالفت کے بعد اپریل 2012 میں CPJ کے بلاگ کیلئے لکھتے ہوئے۔

"سارے ہی قتل ایک المیہ ہیں لیکن صحافیوں کے ہلاک ہونے پر، عوامی مباحثہ ایک ایسی آواز سے محروم ہو جاتاہے جو جمہوریت کیلئے ایک اہم تعاون فراہم کرسکتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ حکومت صحافیوں کو اپنا کام انجام دینے کیلئے محفوظ حالات کو یقینی بنانے کے واسطے اپنی سکت کے مطابق پوری پوری کوشش کرے۔"
--ارینا بوکووا، ڈائرکٹر جنرل آف یونیسکو، کراچی میں صحافی ثاقب خان کی ہلاکت کی مذمت کرتے ہوئے دسمبر 2012 کے بیان میں۔

2. خیبر پختونخواہ میں ایک موت

17 جنوری2012 کی شام کو، کراچی کی ایک مصروف سڑک پر جیو ٹی وی کے نامہ نگار ولی خان بابر کے قتل کے ایک سال چار دن بعد، پاکستان کے قبائلی علاقے شب قدر میں سینئر صحافی مکرم خان عاطف اپنے گھر کے قریب ایک مسجد میں مغرب کی نماز ادا کر رہے تھے۔ دو افراد وہاں پہنچے اور ان پر تین گولیاں چلائیں، جو ان کے سینے اور سر میں لگیں۔ ایک گولی عاطف کا بدن پار کرگئی اور اس گولی نے امام کو بھی زخمی کردیا۔ اسی رات ہسپتال میں عاطف کی موت ہوجانے کا اعلان کردیا گیا۔

تقریبا اس کے فوراً بعد ہی قبائلی علاقوں میں اپنی اساس رکھنے والی تحریک طالبان پاکستان کے ترجمان، احسان اللہ احسان نے پیشاور میں صحافیوں کو بلاکر کہا کہ عاطف کو غیر ملکی میڈیا میں ٹی ٹی پی کے خلاف پروپیگنڈا بند کرنے کی تنبیہ کی گئی تھی اور ان سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ اپنے مضامین میں ٹی ٹی پی کے نظریوں کی حمایت کریں - انہوں نے بتایا کہ چونکہ عاطف نے ان کے مطالبات کو نظر انداز کردیا تھا لہذا ٹی ٹی پی نے انھیں مار ڈالا۔ احسان نے متنبہ کیا کہ ٹی ٹی پی نے اپنی ہٹ لسٹ میں متعدد دیگر صحافیوں کو نامزد کیا ہے- اور اگر وہ راہ راست پر نہیں آئے تو وہ بھی اپنا انجام دیکھ لیں گے۔

صدر اور وزیر اعظم نے اس ہلاکت کی مذمت کی اور اہل خانہ کے ساتھ اپنی تعزیت کا اظہار کیا۔ قبائلی علاقوں کے صحافی حضرات غصے میں تھے، صرف اس وجہ سے نہیں کہ ان کے دوست اور ساتھی کی موت ہوگئی ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ طالبان ایک ایسے صحافی کو ہلاک کرسکتے ہیں جو اس قدر انصاف پسند تھا، اور ہمیشہ ان کے رابطے میں رہتا تھا۔ سماء ٹی وی کیلئے کام کرنے والی مہمند ایجنسی سے تعلق رکھنے والے ایک قریبی دوست شمس مہمند نے بتایا، "ہم اکثر مکرم کے ساتھ اس بات پر ہنستے تھے کہ وہ گویا طالبان کے ترجمان ہیں۔ وہ مقامی لوگوں اور طالبان میں کافی مشہور تھے - لہذا وہ اس ہلاکت کا دعوی کیوں کریں گے؟"

لگ بھگ 45 برس کی عمر کے استاد، شاعر اور سماجی کارکن عاطف وفاقی لحاظ سے زیر انتظام قبائلی علاقوں (فیڈرلی ایڈمنسٹرڈ ٹرائبل ایریا) یا ایف اے ٹی اے کے انتہائی سینئر صحافیوں میں سے ایک تھے۔ اور وہ اپنے ساتھیوں کیلئے ایک مثالی شخصیت تھے۔ عاطف نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کی شروعات کوئی 20 سال پہلے کی تھی، جب وہ اردو زبان کے ایک روزنامہ کیلئے قبائلی علاقوں سے رپورٹیں تحریر کرتے تھے اور انہوں نے ایک ادبی ماہنامے کی بنیاد بھی رکھی تھی۔ امریکی حکومت کے مالی تعاون سے چلنے والے وائس آف امریکہ کی پشتو زبان کی سروس، دیوا ریڈیو نے جب 2006 میں نشریات شروع کیں تو عاطف اس کے مقامی نامہ نگار بنے۔

عاطف مقامی ادبی تنظیم میں شامل تھے اور انہوں نے ایک ساتھی شاعر، ایک نوعمر شخص عمر خالد کے ساتھ دوستی قائم کی، جو مہمند میں ٹی ٹی پی کے سربراہ بنے۔ عاطف کی موت ہونے کے دن تک وہ دونوں دوست تھے۔ انہوں نے شاعری پر اور، ناگزیر طور پر عاطف کی ریڈیو رپورٹوں کی بابت طالبان کے غم و غصے پر بات کی۔ امریکی حکومت کے مالی تعاون سے چلنے والے ریڈیو فری یوروپ / ریڈیو لبرٹی کی پشتو زبان کی سروس دیوا ریڈیو اور ریڈیو مشعل پر قبائلی علاقوں میں قریبی نگاہ رکھی جاتی ہے کیونکہ ان کے پروگرام مقامی مسائل کیلئے وقف چند پروگراموں میں سے ہیں۔ اسی اہمیت کی وجہ سے دیوا اور مشعل میں کام کرنے والے ، صحافی ایک شکنجے میں جکڑے ہوے ہیں اور ٹی ٹی پی، فوج اور واشنگٹن یا یوروپ میں بیٹھے اپنے مدیروں کے ذریعے یہ شکنجہ کسا جاتا ہے۔ طالبان کو "دہشت گرد" کہہ کر بلائے جانے

پر اعتراض ہے اور وہ اس بات پر احتجاج کرتے ہیں کہ واقعات کے تئیں ان کا مطمح نظر شاذ و نادر ہی نشر کیا جاتا ہے۔

"مکرم نے ایک خودکش حملے میں نشانہ بنائے جانے والے سرحدی کانسٹبلوں کے اہل خانہ کی دردناک داستان کو ریکارڈ کیا تھا اور یہی اصل بات تھی جس کی وجہ سے طالبان ان سے ناراض تھے ،" یہ کہنا ہے ابراہیم شنواری کا جو خود بھی VOA کیلئے رپورٹنگ کرتے ہیں اور بذات خود انہیں بھی کئی بار دھمکیاں ملی ہیں۔ شنواری یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ طالبان نے عاطف کو بار بار تنبیہ کی تھی کہ "VOA در اصل امریکیوں کی آواز ہے اور VOA کو جنگجوؤں کی آواز قابل قبول نہیں ۔" وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "مکرم نے اس مسئلے پر مجھ سے گفتگو کی تھی کہ جنگجو اس وقوعہ پر اپنا رخ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب رپورٹیں ریڈیو پر نشر کی گئیں تو، رپورٹ میں ان کا رخ ندارد تھا۔"

باضابطہ طور پر، عاطف کی موت کوئی راز نہیں ہے۔ وہ دہشت گردی کی جنگ، طالبان کی تلخیصی تکملات اور امریکی پروگراموں کا ایک اور شکار ہے جو ان کے ساتھ وابستہ مقامی لوگوں کو خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ لیکن بے ضابطہ طور پر، میں نے جتنے لوگوں سے بات کی ان میں سے بیشتر اس بات پر یقین نہیں کرتے ہیں کہ عاطف کو طالبان کے احکامات پر یا عوامی طور پر بیان کردہ وجوہ کے سبب ہلاک کیا گیا تھا۔

نومبر 2011 میں، امریکی طیارے نے افغانستان کی سرحد کے قریب سلالہ میں دو پاکستانی آؤٹ پوسٹ پر دھاوا بولا تھا، جس میں 24 پاکستانی سپاہی ہلاک ہوگئے تھے۔ پاکستان اور امریکہ کے آپسی تعلقات واقعتاً خراب تھے۔ 27 جنوری 2011 کو CIA کیلئے کام کرنے والے ایک امریکی ٹھیکیدار ریمنڈ ڈیوس نے لاہور کی مصروف سڑکوں پر دو پاکستانی ایجنٹوں کو مار گرایا تھا، اور یہ دعوی کیا تھا کہ انھوں نے یہ کام اپنی مدافعت میں کیا ہے۔ پولیس نے انہیں گرفتار کرلیا اور دونوں حکومتوں کے بیچ ایک سفارتی دراڑ پڑگئی۔ آخر کار امریکیوں نے اہل خانہ کو خوں بہا ادا کیا اور پاکستان نے ڈیوس کو رہا کردیا۔ معاملے کی ابتداء میں آئی ایس آئی اور فوج نے اس وقت کے پاکستانی سفیر حسین حقانی کو زیر کرنے کی کوشش کی کیونکہ انھوں نے بہت ساری چیزوں کے ساتھ ساتھ امریکی شہریوں کو بہت سے ویزے جاری کیے جو ڈرون پروگرام میں شامل ایک بڑے نیٹ ورک کا حصہ تھے، اور اس کا خاتمہ اسامہ بن لادن کو نشانہ بنانے پر ہوا۔ مئی 2011 میں، امریکا نے ایبٹ آباد میں اپنی چھاپہ ماری شروع کی، جس میں نہ صرف بن لادن کی موت ہوئی بلکہ اس عمل نے پاکستانی فوج کے وقار اور فخر کو بھی کچل ڈالا۔ مقامی صحافی فوج کا خوف اور احترام بھول گئے۔

اواخر مئی 2011 میں، القاعدہ سے تعلق رکھنے والے جنگجوؤں نے کراچی میں مہران بحریہ کے اڈے پر حملہ کیا، جس سے ایک بار پھر فوج کی بے عزتی ہوئی۔ یہ وقت انٹلی جنس ایجنسیوں کیلئے تنقید کا وقت تھا۔ *ایشیاء ٹائمز آن لائن* کے پاکستانی نامہ نگار سلیم شہزاد، جنھوں نے اس علاقے میں کسی اور صحافی کی بہ نسبت زیادہ قریب سے طالبان کی کوریج کی تھی، اور جنھوں نے پاکستانی بحریہ میں القاعدہ کی گھس پیٹھ کی اطلاع دی تھی، لاپتا ہو گئے۔ چند دنوں کے بعد وہ مردہ حالت میں ملے تھے، اور ان کی لاش پر اذیت پہنچانے کے نشان موجود تھے۔

ستمبر 2011 میں امریکی جائنٹ چیفس آف اسٹاف، ایڈمرل مائکل مولن نے کانگریس کے سامنے اپنے بیباک الوداعی بیان کے ساتھ امریکہ اور پاکستان دونوں کو یہ کہہ کر جھنجھوڑ ڈالا تھا کہ افغانستان میں دراندازی کرنے والا حقانی نیٹ ورک، در اصل پاکستان کی انٹر سروسز انٹلی جنس کے زیر کفالت جنگجو نیٹ ورک ہے۔ انہوں نے نامہ نگاروں کو یہ بھی بتایا

کہ شہزاد کو پاکستانی فوج کے سربراہ اشفاق کیانی اور آئی ایس آئی کے اس وقت کے ڈائرکٹر جنرل شجاع پاشا کے احکامات پر ہلاک کیا گیا تھا۔ پینٹاگن کے ایک اہلکار اور مولن کے قریبی سہایک نے مجھ سے بتایا، "20 ستمبر کو آپ نے جو کچھ دیکھا وہ پاکستان کے اپنے کام کرنے کے رویے میں تبدیلی نہ کرنے کے انکار کی وجہ سے پیدا ہونے والی تلخی اور مایوسی کا نتیجہ تھا ۔ "

موسم گرما میں بیشتر مہلک اور بے باک حملے دیکھنے میں آئے جن کی شروعات پاکستان سے ہوئی۔ کابل میں انٹرکانٹینینٹل ہوٹل پر حقانی نیٹ ورک کا حملہ ہوا تھا۔ 11 ستمبر کے حملے کی 10 ویں برسی پر واردک ٹرک بم حملہ ہوا تھا جس میں 77 امریکی سپاہی ہلاک ہوگئے تھے۔ مولن کے سہایک نے کہا کہ "اس بات نے انہیں غیظ و غضب سے بھردیا۔ ہم نے پاکستانیوں کو بتایا کہ ایک ٹرک بم ہماری طرف آ رہا ہے، اور انہوں نے اس بارے میں کچھ کرنے کا عہد تو کیا مگر کیا کچھ نہیں۔ اور پھر شہزاد کا قتل ہوا ۔ وہ غصے میں بھرے ہوے اور اپنے ڈیسک کو مار رہے تھے ۔ انھوں نے ہلاکت کو روکنے کیلئے آئی ایس آئی اور حکومت کو آگے آنے کو کہا۔ آخر انہیں جنرل کیانی اور پاکستانی فوجی ادارے کی جانب سے دھوکہ ملنے کا احساس ہوا۔"

پھر، دونوں ممالک کے رشتوں میں دوری آنے کے ساتھ، سلالہ اور امریکہ کے ذریعہ پاکستانی سپاہیوں کی ہلاکت کا معاملہ پیش آیا۔ پاکستانیوں نے اظہار افسوس کا مطالبہ کیا اور ناٹو افواج کیلئے سپلائی روٹ کاٹ دیے۔ امریکی فوج نے تفتیش کی، مگر پاکستانیوں نے تعاون کرنے سے انکار کیا اور نتائج پر تنازعہ اٹھایا۔ سات ماہ کی خاموشی کے بعد وزیر خارجہ ہیلری روڈھم کلنٹن نے ایک بیان میں معذرت ظاہر کی اور کہا کہ "غلطیاں" اس حملے کا سبب بنیں۔

مکرم خان عاطف نے سلالہ حملے کے تعلق سے اولین رپورٹیں دیوا ریڈیو کیلئے پیش کی تھیں اور دو رخی کہی جانے والی لائیو بات چیت میں بھی حصہ لیا، جس میں اسٹیشن کے اسٹوڈیو میں موجود صحافیوں کے ساتھ لائیو تبادلہ کیا جاتا ہے۔ شناخت ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بات کرتے ہوئے، قبائلی علاقے کے ایک صحافی نے بتایا کہ مقامی باشندوں نے عاطف کو بتایا تھا کہ پاکستانی چیک پوسٹوں سے محض دو کلو میٹر کے اندر ایک طالبان چھپا ہوا ہے۔ فوج سے طالبان کی مفروضہ قربت - اس صحافی کے بقول "ان کی ناک کے نیچے" – انتہائی حساس معلومات تھی کیونکہ شاید اسی نے امریکی حملے کو کچھ جواز فراہم کیا تھا۔ صحافی نے بتایا کہ اس کے فوراً بعد ہی عاطف کو پاکستانی فوج، سیکیورٹی ایجنسیوں، اور طالبان سے دھمکیاں ملنی شروع ہو گئی تھیں کیونکہ یہ سبھی نشر ہونے والی رپورٹ سے ناراض تھے۔ مہمند میں عاطف کے رشتہ داروں اور دوستوں نے تصدیق کی کہ دیوا کی رپورٹیں نشر ہونے کے فوراً بعد ہی اسے جنگجوؤں اور سیکیورٹی اہلکاروں کی جانب سے دھمکیاں ملی تھیں۔

دیوا کے مطابق، سلالہ کے تعلق سے عاطف کی رپورٹوں کا کوئی آرکائیو دستیاب نہیں ہے۔ دیوا سروس کے سربراہ نفیس ٹکر کہتے ہیں کہ رپورٹیں عام طور پر 24 گھنٹے کے اندر حذف کر دی جاتی ہیں اورکوئی بھی رپورٹ ایک ماہ سے زیادہ عرصے تک آرکائیو میں نہیں رکھی جاتی ۔ VOA کی ساؤتھ ایشیاء ڈویژن کے ڈائرکٹر سپوزہمائی مائیواندی نے بتایا کہ عاطف کی سلالہ والی رپورٹوں نے اس علاقے کا جغرافیہ بیان کیا تھا لیکن اس میں طالبان کی موجودگی کا ذکر نہیں تھا۔ دیوا کے اہلکاروں نے اس بابت معلومات طلب کرنے سے متعلق CPJ کے بار بار استفسار کرنے پر بھی کوئی جواب نہیں دیا کہ عاطف کے ساتھ ان کے دو رخی تبادلوں کے دوران اسٹیشن کے اسٹوڈیو صحافیوں نے کیا کہا تھا۔

محتاط اور دور اندیش نامہ نگار کے بطور معروف عاطف نے اپنی دیوا رپورٹوں میں طالبان کی قربت کا ذکر کرنے کا کبھی ارادہ نہیں کیا تھا۔ لیکن لائیو، دو رخی تبادلے ہمیشہ فیلڈ رپورٹر کے کنٹرول میں نہیں ہوتے ہیں۔ کئی ایک نامہ نگاروں کے مطابق امریکی پشت پناہی والی نیوز ایجنسیوں کے اسٹوڈیو صحافی، جو اپنے دفتر میں بحفاظت بیٹھ کر ان دونوں رخوں کا اہتمام کرتے ہیں، اکثر حساس معاملے کی سمت مڑ جاتے ہیں یا ایسے اشتعال انگیز سوالات پوچھتے ہیں جو فیلڈ میں کام کرنے والوں کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔

امریکی قومی سلامتی کونسل کے ایک اہلکار سمیت، مختلف ذرائع کے ساتھ کیے گئے متعدد انٹرویو میں مجھے وہی نظریہ بتایا گیا جو امکانی طور پر عاطف کی موت کا باعث بن سکتا ہے۔ ان ذرائع نے نہ صرف یہ کہ عاطف کی موت کو سلالہ کی رپورٹوں سے جوڑا، بلکہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ طالبان نے خود اپنی مرضی سے کام نہیں کیا ہے۔

قبائلی علاقے کے صحافی نے بتایا کہ، "جنگجوؤں نے ان کی موت کی ذمہ داری قبول کی تھی، لیکن میری معلومات کے مطابق، ان کی موت میں آئی ایس آئی والے ملوث تھے۔" جب میں نے ان سے پوچھا کہ طالبان نے کیوں ذمہ داری لی ہے تو، انہوں نے بتایا، "سلیم شہزاد کو ایجنسی نے ہلاک کیا تھا۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے اور ایجنسی نے الزام اپنے سر لے لیا۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ پہلی بار طالبان نے ایک صحافی کی ہلاکت کی ذمہ داری لی تھی۔ اگر وہ ذمہ داری نہ لیتے تو صحافی آئی ایس آئی کو مورد الزام قرار دیتے اور پورے ملک میں احتجاج کرتے۔"

انہوں نے بتایا کہ ایک صحافی کے قتل کی ذمہ داری لینا طالبان کے مزاج کے خلاف تھا۔ "مکرم سے پہلے، 11 قبائلی صحافیوں کو نامعلوم افراد نے ہلاک کیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ انہیں جنگجوؤں نے ہلاک کیا تھا، لیکن انہوں نے کبھی اس کی ذمہ داری نہیں لی۔"

میں نے ان سے پوچھا کہ ان کے خیال میں کیا معاملہ پیش آیا تھا؟ ان کا جواب تھا، "ہر کسی کو معلوم ہے کہ آئی ایس آئی اور طالبان کے قریبی تعلقات ہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ کرنل اور میجر رینک تک کے فوج کے سیکڑوں افراد طالبان کی رینکوں میں کام کر رہے ہیں اور ان کے لمبے بال اور لمبی لمبی ڈاڑھیاں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی فوج کا آدمی یا ایجنسی کا آدمی طالبان کی رینک میں کام کر رہا ہو۔ یا ہوسکتا ہے کہ انہوں نے طالبان سے یہ کام کرنے کو کہا ہو۔"

عاطف کے ایک اور دوست نے مجھے بتایا کہ قتل کے کچھ وقت کے بعد، مہمند ایجنسی میں طالبان کے ایک ترجمان نے مقامی صحافیوں کو بتایا کہ طالبان مجبور تھے، عاطف کو ہلاک کرنے کا حکم "اوپر" سے آیا تھا۔

میں نے ایک پاکستانی صحافی کی مدد سے طالبان کے نام خط لکھا اور عاطف کی موت کے بارے میں گردش کر رہے کلیے کے بارے میں انہیں بتایا۔ ان کا پورا کا پورا ای میل جواب یہ ہے:

> مس روبین، سب سے پہلے اپنے مقدس نبی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نقش قدم پر چلتے ہوئے میں آپ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں، جو امن و خوشحالی کا مذہب ہے اور آپ کو زندگی میں اور اس کے بعد بھی کامیابی کا یقین دلاتا ہے۔
> اب میں آپ کے سوال کی طرف آتا ہوں، ہر کوئی جانتا ہے کہ ہم پاکستان اور پوری دنیا

میں اسلامی قانون نافذ کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہم انسانی زندگی کی قدر کرتے ہیں۔ ہم نے مکرم خان عاطف کو ہلاک کیا اور اس کی ذمہ داری لی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ہمارے دشمنوں کے دعووں کی رپورٹنگ کرتے وقت ہمیں کوئی کوریج نہیں دے رہا تھا جو واضح طور پر صحافت کے اصول کے خلاف ہے۔ اس کے بجائے وہ حکومت کے ذریعے چلائے جانے والے ایک مشن کا حصہ تھا اور اس نے ہمیشہ ہمیں دہشت گرد ثابت کرنے کی کوشش کی، جبکہ ہم دہشت گرد نہیں ہیں۔ ہمارا دعوی ہے کہ وہ ایک جاسوس تھا۔ ہم نے اسے کئی بار تنبیہ کی۔ ہمیں اس ادارے میں ہچکچاہٹ تھی اور اب بھی ہے جہاں وہ کام کرتا تھا اور ہم مستقبل میں بھی نشانہ بنائیں گے، در حقیقت ہم ہر اس صحافی کو نشانہ بنائیں گے جو انصاف اور محض صحافت کے طرز عمل کی خلاف ورزی کرتا ہے۔
ہم صحافت کی آزادی میں یقین رکھتے ہیں۔
منجانب:
احسان اللہ احسان
مرکزی ترجمان ٹی ٹی پی

طالبان سے واقفیت رکھنے والے قبائلی علاقے کے ایک صحافی کو تعجب ہوا کہ حقیقتاً یہ کس کا جواب ہے اور کس نے یہ املاء کرایا ہوگا۔ کیا یہ وہی شخص ہے جس نے عاطف کو مارنے کا حکم دیا تھا؟ لیکن جب بھی میں نے ان سے یہ سوالات پوچھے، انھوں نے کہا، "ہم سبھی جانتے ہیں کہ کس نے مکرم کو ہلاک کیا ہے، لیکن ہم کہہ نہیں سکتے ہیں۔" یا یہ کہنا بجا ہوگا کہ وہ آن دی ریکارڈ یہ بات نہیں کہہ سکتے ہیں۔

جب میں نے عاطف کے قتل میں ایجنسی کی شمولیت کے الزامات کے بارے میں آئی ایس آئی سے پوچھا تو پاکستانی سیکیورٹی کے ایک اہلکار نے مجھے بتایا: "میں اس الزام تراشی کےبارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ کسی کا یقین اس کا ذاتی یقین ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کے ناممکنات پر بھی یقین کرسکتا ہے کہ ایسٹر کا خرگوش انڈے دیتا ہے یا یہ کہ سینٹ نک چمنی کے ذریعے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ پورے طور پر بے بنیاد بات ہے۔" میں نے ان سیکیورٹی اہلکار سے فوج اور طالبان کے اڈوں کی مفروضہ قربت کے بارے میں بھی پوچھا۔ شناخت ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بات کرتےہوئے ان اہلکار نے جواب میں خود ہی سوال کیا، "وہ چوکی وہاں پر سرحد پار سے ہونے والی سرگرمی کو روکنے کیلئے تھی۔ ہم اپنے اڈے کے بغل میں طالبان کا کوئی اڈہ کیوں قائم ہونے دیں گے؟"

بدیہی جواب یہ ہے کہ طالبان کچھ عرصے سے پاکستانی سیکیورٹی ادارے کیلئے ایک اثاثہ ہیں۔ سرحد پر موجود سپاہی فرنٹیئر کارپس سے تعلق رکھتے ہیں، جو بنیادی طور پر قبائلی علاقوں کے پشتونوں پر مشتمل ہے۔ وہ اکثر طالبان کے ساتھ ہمدردی برتتے ہیں یا ان کی مدد کرنے میں انہیں خوف دلایا جاتا ہے۔ دائمی طور پر جب طالبان سرحد پار کر رہے ہوتے ہیں تو وہ دوسری طرف نگاہ کر لیتے ہیں۔

سلالہ حملے میں شامل ایک امریکی فوجی اہلکار نے مجھے بتایا کہ امریکی خصوصی افواج کی ایک مختصر ٹیم اور 120 افغان کمانڈوز افغانستان میں ایک گاؤں پر چھاپہ مار رہے تھے کہ انہیں پاکستانی سرحد پر پہاڑی کی جانب سے فائر کا سامنا کرنا پڑا۔ خصوصی افواج کی ٹیم نے قریب میں ہی واقع فضائی تعاون طلب کیا جس میں کوک کی بوتلوں کے سائز والے بلیٹس

کے راؤنڈ سمیت بارود سے بھرا ہوا ایک AC-130 لڑاکا جہاز شامل تھا۔ انہوں نے بتایا کہ زمین پر خصوصی افواج کی ٹیم نے اور پیچھے بیس کیمپ میں موجود دوسروں نے یہ پتہ لگانے کی کوشش کی کہ آیا سرحد پر پاکستانی سپاہی موجود ہیں؟ انہیں بتایا گیا کہ سپاہی موجود نہیں ہیں۔ علاحدہ طور پر، ایک پاکستانی لائزن آفیسر، جو افغان اور امریکی ہم منصبوں کے ساتھ کام کر رہا تھا، وہ یہ پتہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ پاکستانی سرحدی چوکیوں پر کون گولی چلا رہا ہے؟ بہرکیف، کسی کو بھی قریب ایک گھنٹے 45 منٹ تک صحیح جواب نہیں ملا، یہاں تک کہ ایک امریکی لائزن آفیسر کو جو پاکستان میں رہا کرتا تھا یہ معلوم ہوا کہ AC-130 سے ہونے والے حملے کی زد میں پاکستانی سپاہی ہی ہیں۔

امریکی فوجی افسر نے کہا کہ 24 پاکستانی سپاہیوں کے علاوہ قریب ایک درجن خفیہ درانداز مارے گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اس بات کا امکان ہے کہ اگر امریکی افواج کو پاکستانی سپاہیوں کی موجودگی کے بارے میں پہلے سے اطلاع ہوتی تو شاید وہ طیارے سے تعاقب نہ کرتے اور بھاگتے ہوئے آدمیوں کو بھی ہلاک نہ کرتے۔ تاہم، وہ قریبی فضائی تعاون کو طلب کرنے کے فیصلے کی بابت کوئی دوسرا اندازہ نہیں لگا سکے۔ انہیں یہ گمان ہوا کہ یا تو درانداز امریکی افواج پر فائرنگ کر رہے ہیں اور پاکستانی سپاہی ان پر نظر رکھے ہوئے ہیں، یا پھر وہ ایک ساتھ ہی فائرنگ کر رہے تھے۔

میں نے قومی سلامتی کونسل میں ایک امریکی اہلکار سے بات کی جنہوں نے ایک الگ ہی مدعا بیان کیا۔ انہوں نے بتایا، "فرنٹیئر کارپس سبھی کے سبھی پشتون ہیں جو طالبان کے ہمدرد ہیں اور وہ طالبان کی جانب سے ایک آنکھ موند لیتے ہیں اور امریکی بھی اس بات کو جانتے ہیں۔ لہذا انہوں نے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ وقفے تک جوابی فائر کرنے کیلئے مصروفیت کے اصولوں کا آزادانہ طور پر استعمال کیا۔ جب شوٹروں نے آؤٹ پوسٹ سے فرار ہونے کی کوشش کی تو انہوں نے ان کے ہلاک ہو جانے کا یقین کرنے کیلئے ان کا پیچھا کیا۔ اسے ان چیزوں کی فہرست میں شامل کریں جو فوج کو اتنے لمبے عرصے تک فیلڈ میں چھوڑ دینے کی صورت میں پیش آتی ہیں۔"

امریکی سیکیورٹی اہلکار کا کہنا ہے کہ ان کا بھی ماننا ہے کہ عاطف کے قتل کے پیچھے پاکستانی انٹلی جنس تھی۔ لیکن اس کا کوئی براہ راست ثبوت نہیں ہے، اور غالباً کبھی نہیں ملے گا۔ کسی باضابطہ چھان بین کے بغیر، کسی عدالتی کارروائی کے بغیر، کوئی مقدمہ قائم نہیں ہوگا، اور قبائلی علاقے میں رہنے اور کام کرنے والا کوئی بھی شخص پیشقدمی نہیں کرے گا۔ ہمارے لیے تو بس گمنام اندازے اور ان صحافیوں اور مقامی لوگوں کے تجربے رہ گئے ہیں جنہیں معلوم ہے کہ کام کس طرح ہوتا ہے، جن کی اس علاقے میں ایک تاریخ ہے، اور جو سابقہ ہلاکتوں کا موازنہ موجودہ ہلاکتوں سے کرسکتے ہیں۔ اب تو ہر کسی کو معلوم ہے کہ طالبان اور آئی ایس آئی میں رابطے ہیں، اور پاکستانیوں کی نگاہوں میں "اچھے، فائدے مند" طالبان اور "برے" طالبان ہیں۔ طالبان کو بھی معلوم ہے کہ وہ قابل توسیع ہیں۔ کبھی کبھی وہ آئی ایس آئی کے اپنے آلہ کاروں کےساتھ محتاط رقص کرتے ہیں اور کبھی کبھی سرکشی بھی کر گذرتے ہیں۔ انہیں بغیر کسی معاوضے کے کسی کو قتل کرنے کیلئے بحال کیا جاسکتا ہے، لہذا کبھی کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ بندوق کا گھوڑا دبانے کا حکم کس نے دیا۔ لیکن سرخ لکیر واضح ہے: پاکستانی فوج، آئی ایس ائی، اور ان کے اثاثوں کے بیچ کے تعلقات پر رپورٹ نہ دیں۔ یہ مبینہ قومی مفاد کے خلاف ہے۔

خیبر پختونخواہ صوبے میں صحافیوں کو خوف میں مبتلا کرنے کا ایک چلن سا ہے، اور یہ ایک ایسی علت ہے جو پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ صحافیوں کے ذرائع فوج، انٹلی جنس، جنگجوؤں میں ہیں اور بسا اوقات وہ "سیکیورٹی" کے جال میں بڑی گہرائی تک پھنس جاتے ہیں۔

دھمکی کے تحت ملک چھوڑ دینے والے قبائلی علاقے کے ایک صحافی نے بتایا، "پریس میں آئی ایس آئی کے بہت لوگ ہیں جو میڈیا میں رہ کر ان کے ساتھ کام کرتے ہیں، جو اپنے پے رول پر ہیں۔ بیشتر معاملات میں بس رابطے بنانے کی دیر ہوتی ہے، اور دونوں سمتوں سے ایک دوسرے کا تعاون کیا جاتا ہے۔ ایک بار میرا ایک دوست آئی ایس آئی کے ایک آدمی کو لے کر میرے گھر آیا جس کو انالسس ونگ میں منتقل کردیا گیا تھا۔ میں نے اس سے میڈیا ونگ میں رابطوں کے بارے میں پوچھا اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا کہ اگر وہ میڈیا کے لوگوں سے میرا تعارف کروائے تو رقم کی توقع کی جا سکتی ہے؟ میں نے نہیں میں جواب دیا کیونکہ مجھے تو بس رابطے درکار تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے کتنے کھلے انداز میں رقم کی پیشکش کر دی تھی۔ اس کا کہنا تھا، "اس کے پاس ہمارے پے رول میں بہت سارے لوگ ہیں۔"

انہوں نے مزید بتایا: "میرا تعارف وزیرستان کے ایک کرنل سے کروایا گیا تھا۔ ایک آدھ بار ہماری ملاقات بھی ہوئی اور وہ معاون ثابت ہوے۔ وہ مجھے اس بارے میں عمومی مشورہ دیتے تھے کہ قبائلی علاقوں میں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن پھر انھوں نے ہمارے ذرائع کو ان کو دینے کو کہا کیونکہ وہ اسے اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ میں وہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے دھیرے دھیرے خود کو ان سے دور کرلیا اور سوچ لیا کہ وہ مجھے جو کچھ دیتے ہیں اس کی مجھے ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ آپ کے قریب آتے ہیں اور اگر آپ ان کی بات نہیں سنتے تو آپ مشکل میں پڑجاتے ہیں۔"

قبائلی علاقوں میں پریس کیلئے، 2009 میں موسا خان خیل کا قتل، جو دی نیوز اور جیو ٹی وی کیلئے کام کرتے تھے، اس سہولت کی علامت بن گئے تھے جس کے سہارے کوئی شخص کسی صحافی کو ہلاک کرسکتا تھا اور اس کا ارتکاب کرنے والا شخص سزا سے بریت کا مزہ اٹھا سکتا تھا۔ سوات کے طالبان کے خلاف 2009 کے فوجی آپریشن کے دوران، جس نے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، خان خیل نے اسلام آباد پہنچ کر جیو میں اپنے باس لوگوں سے شکایت کی کہ فوج آپریشنوں اور نیوز کانفرنسوں میں جانے سے انہیں ممنوع قرار دے کر انہیں سزا دے رہی ہے۔ جیو کو انہیں نشریات سے نکال دینا پڑا اور خان خیل نے دوسرے آؤٹ لیٹس میں فوج کے خلاف گول مول بیانات شائع کرکے انتقام لیا۔ اس کے بعد انہیں اغوا کرکے مارا پیٹا گیا ۔

حامد میر جو اس وقت خان خیل کے سپروائزر تھے یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں، "وہ میرے پاس آئے اور بولے، 'میرا بیان ریکارڈ کریں۔'" میر نے خان خیل کا بیان دی نیوز میں اپنے کالم میں شائع کیا۔ آئی ایس آئی کی داخلی ونگ کے سربراہ نے میر کو یقین دلایا کہ خان خیل کو کچھ نہیں ہوگا، لیکن چند دنوں کے بعد ہی خان خیل نے سوات سے فون کیا۔ میر کہتے ہیں، "انہوں نے مجھ سے کہا کہ آئی ایس آئی مجھے مار ڈالے گی اور طالبان پر الزام دھر دے گی۔ پھر انہوں نے مجھے دوبارہ فون کیا اور کہا، 'انہوں نے جیو سے کسی کو مارنے کا فیصلہ کیا ہے۔' میں نے ان سے ہوٹل نہ چھوڑنے کے لیے کہا اور کراچی میں جیو کے منیجنگ ڈائرکٹر کو فون کیا۔ ایک گھنٹے کے بعد [خان خیل پر] 32 گولی داغ کر مار ڈالا گیا ۔ پیغام؟ 'ہم سے بدزبانی نہ کرو۔'"

جب میں نے میر کے الزامات کے بارے میں پاکستانی سیکیورٹی اہلکار سے پوچھا تو ان کا کہنا تھا، "وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں انہیں کہنے دیں۔ لیکن میری بہترین معلومات کی حد تک ہم اس قسم کی سرگرمی میں ملوث نہیں ہوتے ہیں۔"

"ہلاک کرنا یا دھمکی دینا؟" میں نے پوچھا۔ وہ بولے، "دونوں۔"

میں نے ان سے کہا کہ آئی ایس آئی سے خوف محسوس کرنے والے صحافیوں کی ایک کثیر تعداد کو دیکھتے ہوئے مجھے آپ کا یہ جواب سن کر حیرت ہوئی۔ اس کے باوجود بھی وہ اس دعوے پر اڑے رہے اور یہ پوچھ بیٹھے کہ صحافی "وجہ اور منطق" کو بغور سنتے ہیں۔

انہوں نے بتایا، "جب میں کسی سے بات کرتا ہوں تو وجہ اور منطق کے ساتھ بات کرتا ہوں اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرتا ہوں۔ آپ اسے خریدنا چاہتے ہیں؟ میرے لیے ٹھیک ہے۔ آپ اسے خریدنا نہیں چاہتے ہیں؟ میرے لیے ٹھیک ہے۔" انہوں نے کہا کہ وہ آئی ایس آئی میں موجود ہر کسی کے بارے میں بات نہیں کرسکتے ۔ بس اسی طریقے سے انہوں نے اپنی میٹنگ کا انعقاد کیا۔ اور ایک بار پھر بتا دیں کہ اگر آپ کسی صحافی کو اپنا نقطۂ نظر خریدنے کی ترغیب دیتے ہیں اور آپ آئی ایس آئی کے ساتھ ہیں، تو آپ کے الفاظ کسی اوسط شہری کی بہ نسبت کافی دور رس مضمرات کے حامل ہوتے ہیں۔

میر نے، جو ماضی میں اکثر و بیشتر آئی ایس آئی اور جنگجوؤں میں قریبی اتحاد ہونے کا الزام لگاتے رہے ہیں، انھوں نے مجھے بتایا، "میں ساتھیوں سے کہتا رہتا ہوں کہ 'طالبان پر بھروسہ نہ کریں اور آپ اس طرح ملنے والی 50 فیصد دھمکیاں کم کردیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ریاستی ادارے اس سے بہتر ہوں۔' اب وہ کہتے ہیں، 'ہم سوچا کرتے تھے کہ انتہا پسندوں سے نجات حاصل کرنے کیلئے وہ بھی ہماری ہی طرح اسی رخ پر ہیں، لیکن یہ ہماری خام خیالی تھی۔'" حقیقت تو یہ ہے کہ ہلاکتوں کے نظریے سے ایجنسی کا فلسفہ طالبان کے فلسفے سے کوئی زیادہ مختلف نہیں ہے۔ جیسا کہ میر نے مجھ سے بتایا، "ایجنسی کے سبکدوش اہلکاران مجھ سے کہتے ہیں، 'ہمارا ماننا ہے کہ وسیع تر قومی مفاد کے تحفظ کیلئے انسانوں کو ہلاک کرنا کوئی غلط کام نہیں ہے۔'"

فوجی نقطۂ نظر سے، کمانڈرز کیوں چاہیں گے کہ سوات میں ان کے آپریشن کے دوران حقیقی رپورٹنگ نکل کر سامنے آئے؟ اس سے فوج اور خاص طور پر سوات طالبان کے عروج میں آئی ایس آئی کی شمولیت کے بارے میں بہت سی باتیں آشکارا ہوجائیں گی، اور اس سے ان کے پروپیگنڈے کی بیخ کنی ہوگی۔ بی بی سی کے ایک مدیر نے مجھے بتایا کہ 2009 میں، وہ مہمند کے قریب چار سدّہ میں ایف ایم نشریات چلا رہے تھے۔ " فوج نے 2009 میں سوات آپریشن کے بعد اسے بند کردیا گیا۔ انہوں نے ہم سے کہا، ہم پاکستان میں ایک پروپیگنڈہ مہم چلا رہے ہیں اور اس کے خلاف ہونے والی کوئی بھی چیز اس مہم کو نقصان پہنچاتی ہے۔'" کہنے کے لحاظ سے، ریڈیو فری یوروپ / ریڈیو لبرٹی اور وائس آف امریکہ کے پاس پاکستان میں بھی ٹرانسمیٹرز یا ٹاورز نہیں ہیں۔ بی بی سی کے ایڈیٹر نے بتایا،"ہمارے ٹرانسمیٹرز مسقط، عمان میں بھی ہیں۔ ایف اے ٹی اے میں کوئی موبائل نہیں ہے، کوئی ایف ایم نہیں ہے، کوئی ٹیلیویژن نہیں ہے۔ جب تک ہمارے پاس قبائلیوں کے ذریعے چلایا جانے والا مضبوط میڈیا نہیں ہوگا اس وقت تک غربت، ناخواندگی اور جنگجوئیت کو ختم کرنے کا کوئی راستہ نہیں نکلے گا۔"

موسا خان خیل کی ہلاکت سوات آپریشن کے دوران پیش آنے والی صرف ایک صحافی کی ہلاکت نہیں تھی۔ اگست 2009 میں، دی ایسوسی ایٹڈ پریس، سی این این، العربیہ، اور پشتون زبان کے ٹی وی اسٹیشن شمشاد کیلئے رپورٹنگ کرنے والے جان اللہ ہاشم زادہ کو ایک خفیہ کمین گاہ میں مار ڈالا گیا۔ وہ ایک پسنجر کوچ میں سوار تھے جو خیبر ایجنسی سے گزر رہی تھی کہ انٹلی جنس ایجنسی کی معیاری گاڑی، سفید سیڈان پر سوار چار بندوق برداروں نے بس کو روک لیا۔

انہوں نے بس ڈرائیور کو زبردستی اتار دیا اور پھر بس میں ہاشم زادہ کے ماتھے پر گولی ماردی، جس سے وہ موقع پر ہی ختم ہوگئے۔ خیبر پختونخواہ کے ایک صحافی داؤد خٹک نے، جو اب پراگ میں RFE/RL کیلئے کام کر رہے ہیں، کہا، "جان اللہ میرے بڑے اچھے دوست تھے۔ اپنی موت سے چند دن قبل ہی انہوں نے طالبان کے ترجمان ذبیح اللہ مجاہد کا انٹرویو کیاتھا، اور اپنی خبر مضمون میں انہوں نے بتایا کہ انہوں نے پیشاور کے حیات آباد علاقے میں ان کا انٹرو لیا۔" دوسرے لفظوں میں، مجاہد پاکستان کے کافی بھرے پرے شہروں میں کھلے عام رہ رہے تھے۔ خٹک کہتے ہیں، "ہم نے انہیں بتایا کہ اس سے ان کیلئے مسئلہ ہوسکتا ہے۔ زرداری اس وقت اپنے امریکی دورے پر تھے۔"

بہت سے صحافیوں کا مشترکہ خیال یہ ہے کہ ہاشم زادہ کسی ایجنسی کی ہلاکت کا دوسرا شکار تھے۔ ان کے لحاظ سے، انداز واضح ہے۔ جب کوئی صحافی کوئی ایسی حقیقت نشر کرتا ہے جس سے فوج یا انٹلی جنس کے ساز و سامان کی تحقیر ہو تو، کوئی اہلکار اس سے ملے گا، اسے فون کرے گا، اسے متنبہ کرے گا، اور کچھ حالات میں، اگر یہ زیادہ کثرت سے ہو تو اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔

جب میں نے آئی ایس آئی سے ہاشم زادہ کے قتل کے بارے میں دریافت کیا تو سیکیورٹی افسر نے کہا: "میں نے تو ایسی کوئی کہانی نہیں سنی!"

"کون سا حصہ؟ جان اللہ ہاشم زادہ کا قتل یا یہ الزامات کہ آئی ایس آئی نے اسے ہلاک کیا ہے،" میں نے پوچھا۔ "دونوں ہی۔ میں اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ۔"

کبھی کبھی معلومات کا دفاعی حصہ ہی ساری معلومات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ سماء ٹی وی کیلئے کام کرنے والے شمس مومند بھی سالوں سے ان مکارانہ معاملات کی چھان بین کر رہے ہیں کیونکہ عاطف کی طرح ہی ان کا تعلق بھی مہمند ایجنسی سے ہے۔ 2011 میں، فوج دعوی کر رہی تھی کہ مہمند سے طالبان کا صفایا ہوگیا ہے اور زندگی معمول پر لوٹ آئی ہے۔ جو بھی شخص وہاں رہتا ہے اسے حقیقت معلوم ہے۔ باذار ابھی تک بند تھے ۔ سڑکیں اب بھی بند تھیں۔

مومند کہتے ہیں، "لہذا، میں نے رپورٹ دی کہ مقامی لوگ ڈرتے ہیں اور ان کے کاروبار اور سرگرمیوں پر طالبان کے ذریعے پابندی عائد ہے۔ اس کے بعد فوج نے میرے وہاں جانے پر پابندی لگا دی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہونے کی رپورٹ پیش کریں۔" حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ مومند سے اپنی ملاقات ہونے سے قبل والی شام کو طالبان نے مہمند میں ایک اسکول کو تباہ کردیا تھا؛ جس وقت ہم نے بات کی اسی وقت ان کے پاس ایک فون آیا کہ ایک IED ابھی ابھی آس پاس کی ایک سڑک پر پھٹاہے۔

اگر ان چاہی سچائیوں کو آشکار کرنا مہلک ہوسکتا ہے تو کسی امریکی یا مغربی میڈیا آؤٹ لیٹ یا تحقیقی ادارے کے ذریعے بر سر ملازمت ہونا بھی خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ بہت سارے صحافیوں نے رپورٹوں میں اپنا نام استعمال کرنا بند کردیا ہے۔ ریاض گل نے، جو ریڈیو مشعل کیلئے اسلام آباد میں مقیم ہیں، مجھے بتایا کہ مارچ 2012 میں انہیں ٹی ٹی پی کے ایک ترجمان کی جانب سے فون آیا تھا، جس میں انہیں سوات میں ایک حملے کی خبر دی گئی تھی۔ اسلام آباد میں جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو گل نے اس بات چیت کو میرے لیے یوں دہرایا تھا، " اس نے کہا 'آپ مشعل والے لوگوں کو ہماری باتیں نشر کرنی چاہیئے؛ ورنہ ہمیں آپ سے نپٹنے کا طریقہ خوب معلوم ہے۔ مشعل میں آپ سبھی لوگ ایک جماعت بن جاتے ہیں اور غیر جانبدار نہیں ہوتے، لہذا جس طرح آپ دوسروں کو، جیسے پولیس اور ایجنسیوں کو

کوریج دیتے ہیں اسی طرح ہمیں بھی کوریج دیں۔ یہ آپ کا فریضہ ہے۔' میں نے کہا، 'ہم اپنا کام انجام دے رہے ہیں۔ اگر ہم اپنی رپورٹیں صدر دفتر کو بھیجتے ہیں تو ہم کچھ نہیں کرسکتے ؛ یہ فیصلہ کرنا ان کا کام ہے کہ آیا وہ اسے نشر کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔" پاکستانی ادارے کو معلوم ہے کہ طالبان صحافیوں پر اس طرح کا دباؤ ڈال رہے ہیں، لیکن وہ اس بارے میں کچھ بھی نہ کرکے اسے منظور کرلیتے ہیں۔

بیشتر صحافیوں کے لحاظ سے، در حقیقت، انٹلی جنس ایجنسی کا دباؤ کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

مارچ میں، میری ملاقات قبائلی علاقے سے تعلق رکھنے والے ایک صحافی سے ہوئی جو اسلام آباد میں ریڈیو مشعل کیلئے کام کر رہا تھا۔ وہ ایجنسی کے ذریعے مہینوں تک ہراساں کیے جانے سے اس قدر خوفزدہ تھا کہ آخر کار وہ چھوڑ کر چلا گیا۔ لگتا تھا کہ محض ایک مغربی ریڈیو اسٹیشن کے ساتھ اپنے الحاق کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ حکومت یا فوج سے تعلق رکھنے والے امریکی اداروں کیلئے اپنے تحقیقی مقالوں کی وجہ سے بھی وہ انٹلی جنس اہلکاروں کی نظروں میں آگیا تھا۔

پاکستان سے اپنی روانگی سے عین قبل، میری ملاقات ٹرائبل یونین آف جرنلسٹس کے صدر، صفدر داور سے ہوئی، جو ایف اے ٹی اے میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک دشواری یہ ہے کہ قبائلی علاقوں میں مجازی طور پر کسی بھی تنظیم کی اجازت نہیں ہے۔ داور کہتے ہیں، "یہاں اسلام آباد میں آپ کے پاس عدالت، وزراء، سیاسی جماعتیں، حقوق انسانی کے سرگرم کارکنان، سماجی کارکنان ہیں۔ لیکن قبائلی علاقوں میں،غیر سرکاری تنظیموں (این جی او) کی اجازت نہیں ہے۔ حقوق انسانی کے گروپوں کو کوئی اختیار نہیں ہے، بچہ مزدوری کے کوئی قوانین یا بدعنوانی مخالف کوئی قوانین نہیں ہیں، صرف TUJ ہے۔ لیکن انٹلی جنس کو میڈیا پسند نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں [انٹلی جنس] اتنی آزادی سے کام نہیں کر پاتی۔ انہوں نے قبائلی علاقوں کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا: " ایف اے ٹی اے کے پاس فوج، جنگجوئیت، اور میڈیا ہے — اور کبھی کبھی پہلے دونوں ایک ساتھ تیسرے کے خلاف اکٹھا ہوجاتے ہیں۔

میڈیا کی ملکیت قبائلی علاقے کے لوگوں سے بھی نہیں ہے۔ وہ بنیادی طور پر غیر ملکوں کے زیر نگیں ہیں۔ طالبان غیر قانونی ریڈیو اسٹیشن چلاتے ہیں، لیکن حکومت ریڈیو اسٹیشن کیلئے معمولی شہریوں کو لائسنس جاری نہیں کرے گی – جو ایک سے لے کر ساری قسم کے سازشی کلیوں کا سبب ہے اگر آپ ایف اے ٹی اے کے شہری ہیں۔ داور کہتے ہیں، یہاں کوئی مقامی میڈیا نہیں ہے۔ اس پر پابندی عائد ہے۔ اسی وجہ سے، ہم سے کہا جاتا ہےکہ ہمیں آئین کو تبدیل کرنا ہے۔"

VOA کے نامہ نگاروں کیلئے، ایک مشکل توازن

طالبان کا یہ دعوی کہ انہوں نے اس وجہ سے مکرم خان عاطف کا خاتمہ کیا کہ وہ اپنی اسٹوریز میں ان کا مطمح نظر پیش نہیں کر رہے تھے امریکی حکومت کے مالی تعاون سے چلنے والی نیوز ایجنسیوں کے مقامی نامہ نگاروں کے لیے – اگر چہ خوفناک نہیں لیکن انتہائی پریشان کن تھا۔

VOA کی پشتو زبان کی سروس، دیوا ریڈیو کے نامہ نگا، ابراہیم شنواری کا کہنا ہے کہ وہ نشریاتی ایجنسی کی پالیسیوں کی وجہ سے پس و پیش میں ہیں، اور دوسرے مقامی صحافیوں نے بھی اسی غم و غصے کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عاطف کے قتل کےبعد، ہم نے VOA کے سبھی اعلی افسران کو ای میل کرکے اپنی نازک پوزیشن کی وضاحت کی۔ ...لیکن ان کی طرف سے جواب آیا کہ مطلوبہ افراد کی فہرست میں شامل یا دہشت گرد قرار دیے گئے لوگوں کی باتیں رکھنا VOA کی پالیسی کے خلاف ہے۔

VOA کے منیجروں کاکہنا ہے کہ پالیسی کلی طور پر واضح نہیں ہے۔ مقامی تشویشات کے جواب میں انہوں نے ایک میمو پیش کیا جس میں ایک ایسے مزید تدریجی طریقۂ کار کی نشاندہی کی گئی تھی جو اس فیلڈ میں عام طور پر سمجھے بوجھے تدریجی طریقے سے بہت مختلف ہے۔ شنواری کہتے ہیں، "ہمیں ایک اجتماعی میل میں ہدایات دی گئی تھیں کہ اگر طالبان یا کوئی اور جنگجو گروپ کسی مخصوص واقعے کی ذمہ داری لیتا ہے تو ہم ان کے نظریے کو شامل کریں"۔

VOA کے ترجمان کیلی کنگ نے ایک بیان میں کہا، "دیوا ریڈیو اور ٹیلیویژن نے، جو پاکستان کے قبائلی علاقوں میں نشریات پیش کرتا ہے، اس علاقے میں اپنے رپورٹروں سے مستقل طور پر کہہ رکھاہے کہ طالبان یا کسی دوسرے گروپ کی جانب سے ذمہ داری لینے کے دعوے یا دیگر متعلقہ بیانات کو اسٹوریز میں شامل کیا جائے، اگر وہ اسٹوری کیلئے اہم ہیں۔ ہم انتہا پسند گروپوں کی ایسی تقریریں یا تبصرے نشر نہیں کرتے ہیں جو انفرادی اسٹوریوں کیلئے اہم نہیں ہوتے ۔

طالبان کس چیز کو اہم خیال کرتے ہیں اور VOA کسی دوسری چیز کو اہم خیال کرتا ہے۔ مقامی صحافیوں کو بس اسی نکتہ پر دشواریاں پیش آتی ہیں۔ عاطف کی موت کے بعد، VOA نے کہا کہ اس نے طالبان کی شکایتوں کے بارے میں گفت و شنید کی ہے۔ کنگ کا کہنا ہے: "یہ شکایتیں بے بنیاد ہیں۔ ہماری پالیسی کو نئے سرے سے بیان کرنے کی کوشش میں،ہمارے دیوا سروس کے سربراہ اور ڈویژن ڈائرکٹر نے ای میل بھیجے اور ہمارے مقامی نامہ نگاروں سے ٹیلیفون پر بات کی کہ VOA کی دیرینہ پالیسی کو پھر سے راہ راست پر لایا جائے، اور یہ مطالبہ کیا کہ طالبان سمیت، کسی بھی مسئلے کے سبھی پہلوؤں کو رپورٹ میں شامل کیا جائے۔ مکرم کی موت کے بعد VOA کی پالیسی میں کوئی نرمی یا تبدیلی نہیں آئی ہے۔"

براڈکاسٹنگ بورڈ آف گورنرز نے، جو VOA پر مجموعی طور پر نگاہ رکھتا ہے، بعد از مرگ عاطف کو ڈیوڈ بروک ڈسٹنگوئیشڈ جرنلزم ایوارڈ عطا کیا، جس میں امریکی حکومت کی زیر کفالت اداروں کیلئے رپورٹنگ کرنے والے افراد کے حوصلے، راستبازی اور پیشہ وارانہ انداز کو سراہا جاتا ہے۔ حالانکہ جو لوگ فیلڈ میں ہیں ان کے لحاظ سے امریکی حکومتی اداروں کیلئے کام کرنے کے پرخطر کاروبار سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

3. خوف میں مبتلا کرنا، ساز باز، اور بدلے کی کارروائی

کوئی دو سال پہلے، حامد میر، نجم سیٹھی، عمر چیما اور اخباری میڈیا کی دیگر جانی مانی ہستیوں نے انٹلی جنس ایجنسیوں کی جانب سے خود کو موصول ہونے والی دھمکیوں کو عوام کے سامنے ظاہر کرنا شروع کیا۔ یہ ایک پرخطر حساب کتاب تھا، لیکن انہوں نے یہ توجیہ پیش کی کہ خاموشی کی وجہ سے دہشت پیدا کرنے والوں کا حوصلہ بڑھے گا ۔

دی نیوز کے صحافی چیما کو جو فوج میں بدعنوانی کو فاش کر رہے تھے، انٹر سروسز انٹلی جنس ڈائرکٹوریٹ کے افسران کی جانب سے بار بار تنبیہ کی گئی کہ لکھنا بند کردیں۔ آخری باضابطہ نوٹس آئی ایس آئی اسلام آباد ڈیٹیچمنٹ کے سربراہ کے ساتھ ہونے والی میٹنگ میں آئی جب ایک کرنل نے چیما سے کہا کہ فوج کے زیر اہتمام نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز میں ایک پروفیسر کی پٹائی کے بارے میں وہ اپنے مضامین میں کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ گئے ہیں۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار، وہ شخص جس نے پروفیسر کی پٹائی کی تھی، ایک سابق بریگیڈیر تھے، اور چیما فوج پر خود اپنا ہی تحفظ کرنے کا الزام دھر رہے تھے۔

آئی ایس آئی کی میٹنگ جوشیلی تھی، لیکن یہ اپنی نوعیت کی آخری میٹنگ تھی۔ ستمبر 2010 میں، اگلی بار سابقہ پڑنے پر، چیما کو پولیس کمانڈو کی وردی پہنے لوگوں نے رات کے وقت اس کی گاڑی کو روک لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے راہگیر کو ٹکر مارکر ہلاک کردیا ہے۔ انہیں پتہ تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں لیکن ان کی بات ماننی ہی تھی۔ انہیں ایک گمنام گھر پر لے جایا گیا، تمام کپڑے اتار کر برہنہ کیا گیا، پیٹ پیٹ کر پھوڑا بنا دیا گیا، اور ان کی فلم بندی کی گئی۔ چیما یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں، "جب انہوں نے مجھے رہا کیا تو مجھ سے کہا کہ میں لوگوں کو کچھ نہ بتاؤں۔ انہوں نے میری ننگی تصویریں لیں، پوز دینے پر مجھے مجبور کیا، اور کہا کہ اگر میں نے زبان کھولی تو یہ تصویریں یوٹیوب پر ڈال دی جائیں گی۔ اس کے بعد جب میں گھر کی سمت جا رہا تھا تو، میں یہ سوچ رہا تھا: مجھے کیا کرنا چاہیے؟" بتا دوں؟انہوں نے سوچا۔ "میں نے خود سے کہا کہ مجھے یہی کرنا ہوگا۔ خاموشی میری مدد نہیں کرے گی۔"

چیما کی تحریر آج پہلے سے کہیں زیادہ با اثر ہے، لیکن خوف نے ساتھ نہیں چھوڑا ہے اورنہ ہی اس احساس نے ساتھ چھوڑا ہے کہ کبھی کبھی ان کا پیچھا کیا جاتا ہے۔ اگلی بار اس وقت ان کا تعاقب کیا گیا جب وہ خاندان کے ساتھ سفر کر رہے تھے،گلیوں میں ان کا پیچھا کیا گیا، وہ ایک بار پھر عوام کے سامنے گئے۔ لیکن جلد ہی وہ باز آگئے۔ انہیں یہ ادراک ہوگیا کہ وہ خوفزدہ معلوم پڑنا شروع ہوجائیں گے۔

یہ ایک مکارانہ رقص ہے جو صحافیوں کو فی البدیہ ترتیب دینا ہوتا ہے۔ اگر آپ سیکیورٹی، جنگوں، جنگجوؤں کی کوریج کر رہے ہیں تو لازمی ہے کہ ان کے رابطے سیکیورٹی کے اداروں میں ہوں گے، جہاں عموماً مشکل شروع ہو جا تی ہے۔ میر، سیٹھی، یا محمد ملک جیسے صحافی اس ادارے کے ایک جزء پر سخت حملہ کریں گے، لیکن دھمکیاں اس قدر سنگین سطح تک پہنچ جاتی ہیں کہ انہیں ملک چھوڑنا پڑجاتا ہے، بحران گزر جاتا ہے، اوروہ پھر سے اپنے حملے شروع کردیتے ہیں۔

مئی 2011 میں ایبٹ آباد پر امریکی حملے کے بعد، جب ٹی وی اینکروں نے فوج پر ناکارہ ہونے کا الزام عائد کیا تو، جیو ٹی وی کی انتہائی مشہور شخصیات میں سے ایک ، حامد میر کو بریگیڈیر کی جانب سے ایک فون آیا کہ شجاع پاشا، اس وقت کے ڈائرکٹر جنرل ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ میر کے مطابق، پاشا کے ساتھ بات چیت اس طرح سے آگے بڑھی:

"مسٹر میر، یہ نظام اور پاکستان ایک ساتھ وجود برقرار نہیں رکھ سکتے ہیں۔"
"کون سا نظام؟" میر نے پوچھا۔
"جمہوریت کی پارلیمانی شکل اور پاکستان۔"
"کیا آپ صدارتی شکل کے خواہاں ہیں؟" میر نے پوچھا۔
"ہاں"۔
"یہ آپ کا کام نہیں ہے۔ آئین کو تبدیل کرنا پارلیمان کا کام ہے۔"
اس کے بعد پاشا نے پنجاب کے وزیر اعلی کے بیٹے، صدر کے بیٹے، دیگر وزراء اعلی کے بیٹوں کے بارے میں فحش گوئی کے انداز میں بات کی۔ انہوں نے میر سے پوچھا، "کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچوں پر ایسے بیٹوں کے ذریعے حکمرانی کی جائے؟"

جب اسلام آباد میں ہماری ملاقات ہوئی تو میر نے مجھ سے بتایا، "ہماری میٹنگ بہت ہی خراب رہی۔ وہ پورے وقت سیاست پر ہی بات کرتے رہے۔" اس میٹنگ کے بعد، پارلیمانی جمہوریت، اور مختلف سیاست دانوں کے بیٹوں نے ٹاک شو کے میزبانوں اور کالم نگاروں سے ایک تنقیدی بدلہ لینا شروع کردیا۔ اور اچانک ہی وہ سب کے سب مل کر مشہور سابق کرکٹر سے عوام کا چہیتا سیاستداں بن جانے والے عمران خان کی تشہیر کرنے لگے تھے، جومئی2013 کے انتخابات میں پاکستان تحریک انصاف پارٹی، یا PTI کی سربراہی کر رہے تھے۔ پاشا نے فیصلہ کیا ہے کہ خان کی ہی حمایت کی جائے گی۔ "سیاست دانوں نے مجھے فون کیا، "میر، میر، مجھے مشورہ چاہیے، کیا میں عمران خان کے ساتھ شامل ہوجاؤں؟ پاشا ہم پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔"

جب میں نے آئی ایس آئی سے پوچھا کہ آیا پاشا درپردہ عمران خان کی حمایت کر رہے تھےتو، ایک سیکیورٹی اہلکار نے ان رپورٹوں کی تردید کی۔ اس نے کہا، "پاشا کبھی بھی کسی سیاست داں پر PTI میں شامل ہونے کا دباؤ نہیں ڈال رہے تھے۔ یہ سب الزامات ہیں اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ PTI کو پاشا کی سرپرستی حاصل ہے لیکن اس میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ میں نے پاشا سے کئی بار پوچھا ہے۔"

لیکن ایک اور ٹی وی اینکر نے بتایا کہ انھیں بھی آئی ایس آئی کے ساتھ ایسا ہی سابقہ پڑا ہے۔ شناخت ظاہر نہ کرنےکی شرط پر بات کرتے ہوئے اس اینکر نے بتایا، "ایبٹ آباد سے قبل انہوں نے مجھے فون کیا تھا اس وجہ سے کہ ہم آئی ایس آئی کے سیاسی کردار کی نکتہ چینی کر رہے تھے، جو سیاسی جماعتوں سے الگ راستہ اپنا رہے تھے ۔" دو افسران ان سے ملے اورانہیں موقع پر ہی جا لیا: "آپ آئی ایس آئی کی نکتہ چینی کیوں کرتے رہتے ہیں؟ آپ آئی ایس آئی کا نام اپنی زبان سے کیوں لیتے ہیں؟" اینکر نے بتایا کہ اس نے ٹھوکا دیا: "تو میں نے کہا، اس صورتحال میں ہم آئی ایس آئی کا نام کیوں نہیں لے سکتے ہیں؟" میں نے انہیں بتایا کہ میری دو شکایتیں ہیں ایک یہ کہ آپ صحافیوں کو کیوں ہراساں کرتے ہیں اور دوسری یہ کہ آپ سیاسی عمل میں کیوں مداخلت کرتے ہیں۔" اس سینئر آفیسر نے آئی ایس آئی کے حوالے سے دونوں ہی باتوں کی تردید کی۔ اور اسی طرح اینکر نے پوچھا کہ اگر اس ایجنسی کا کوئی سیاسی ایجنڈا نہیں ہے تو پھر پاشا عمران

خان کی حمایت کیوں کر رہے ہیں۔ "انہوں نے کہا کہ مجھے آئی ایس آئی کی نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیے اور مجھے آئی ایس آئی کا نام نہیں لینا چاہیے۔ میں نے ان کی آراء سے اتفاق نہیں کیا، اور میٹنگ کے اختتام پر اس سینئر شخص نے جونیئر شخص سے کہا: "اسے مزید سیشنز کی ضرورت ہے۔'"

اس طرح کا تبصرہ کھوکھلا لگ سکتا تھا اگر یہ تنقیدی اخباری میڈیا کے خلاف دباؤ ڈالنے، دہشت پیدا کرنے، اور بدلے کی کارروائی کے پاکستان کے بخوبی مسملہ ریکارڈ کیلئے نہ ہوتا۔ایشیا ٹائمز آن لائن کے نامہ نگار، سلیم شہزاد کو ایک طالبان رہنما کی رہائی کے بارے میں ایک مضمون تحریر کرنے کے بعد اکتوبر 2010 میں آئی ایس آئی کے دفتر میں طلب کیا گیا تھا۔ شہزاد نے ساتھیوں کو بتایا کہ میٹنگ کے دوران، آئی ایس آئی میڈیا ونگ، ریئر ایڈمنسٹریشن کے ڈائرکٹر جنرل، عدنان نذیر نے انہیں بتایا کہ اس اسٹوری نے ملک کو بدحواس کردیا ہے اور ان سے گزارش کی کہ وہ مضمون واپس لے لیں اور اپنے مآخذ کا خلاصہ کریں۔شہزاد نے بتایا کہ انکار کرنے پر، نظیر نے جاتے وقت کہا: "سلیم میں آپ کوایک مشورہ دیتاہوں ۔ ہم نے حال ہی میں ایک دہشت گرد کو گرفتار کیا ہے اور پوچھ تاچھ کے دوران اس سے ڈھیر ساری معلومات، ڈائریاں اور دیگر مواد دریافت کیا ہے۔ اس کے پاس ایک ہٹ لسٹ ہے ۔ اگر مجھے اس فہرست میں آپ کا نام ملا تو میں آپ کو بتا دوں گا۔"

شہزاد نے بتایا کہ اس نے اس تبصرے کو اپنی جان کی دھمکی مانا۔ ہم سبھی جانتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہزاد کو یاد داشتیں تحریر کرنے اور اپنے ایڈیٹر ٹونی الیسن اور دوسروں کے نام ایک ای میل میں انہیں ڈالنے میں کافی محنت کرنی پڑی تھی۔ اس نے اپنے ایڈیٹر سے یہ نوٹ "اگر مستقبل میں میرے ساتھ کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو ایک ریکارڈ کے بطور" سنبھال کر رکھنے کو کہا ۔ اس نے ای میل کا ایک ورژن نظیر کو بھی بھیجا جس پر اس نے موضوع والی سطر میں "برائے ریکارڈ" کا لیبل لگایا۔

سات مہینے اور بہت سے تنقیدی مضمون شائع ہونے کےبعد، شہزاد کی موت ہوگئی۔ شہزاد کے قتل کی باضابطہ چھان بین کے دوران، بہت سے صحافیوں نے شہزاد کے ذریعے بیان کردہ ملاقات سے ملتی جلتی بہت ساری ملاقاتوں کے دوران انٹلی جنس کے اہلکاروں کے ذریعے دباؤ ڈالے جانے کی اطلاع دی۔ ساؤتھ ایشین فری میڈیا ایسوسی ایشن کے سکریٹری جنرل امتیاز عالم نے باضابطہ انکوائری کمیشن کے سامنے ایک شہادت میں بتایا، "آئی ایس آئی کو اپنا اہنکار کم کر کے، اپنے لازمی کام پر توجہ مرکوز رکھنا اور میڈیا کے ساتھ اپنے تعلقات میں ایک شفاف پالیسی کو ارتقاء بخشنا سب سے ضروری ہے۔" انہوں نے بتایا کہ اس کی شروعات صحافیوں کو ہراساں کرنے کے طرز عمل پر روک لگانے سے ہونی چاہیے۔

انکوائری کمیشن کے سامنے شہادت میں، نظیر نے شہزاد کے ای میلوں میں اپنی ذات سے منسوب کردہ تبصروں کی تردید کی۔ نظیر نے شہزاد کا "برائے ریکارڈ" والا ای میل موصول ہونے کی بات تسلیم کی لیکن کہا کہ انہوں نے اسے جواب دینے کے قابل نہیں سمجھا۔ آئی ایس آئی کی جانب سے شہادت دینے والے بریگیڈیر زاہد محمود خنارے نے اس بات کی تردید کی کہ یہ ایجنسی صحافیوں کو ہراساں کرنے میں ملوث ہوئی۔

ایک طرح سے فوج اور آئی ایس آئی سکتے میں ہے۔ 2002 میں جب پرویز مشرف نے نجی نشر نگاروں کی لائسنس دہندگی کی اجازت دی تبھی سے میڈیا آؤٹ لیٹس کا سیلاب سا آگیا ہے۔ پریس اس قدر آزاد یا اس قدر نکتہ چیں کبھی نہیں رہی تھی - سیکیورٹی اداروں کے ممبروں کو کبھی اپنی پالیسیوں، خامیوں، اور جرائم کا عوامی فورم میں اس طرح جواب بھی نہیں دینا پڑا تھا جس طرح وہ آج جواب دے رہے ہیں۔ بن لادن والے چھاپے کے بعد میڈیا نے فوج سے جوابات طلب کیے: امریکہ نے یہ آپریشن کس طرح انجام دیا کہ اس کا پتہ نہیں چل پایا؟ کیا فوج اپنے بھاری بھرکم بجٹ کے ساتھ، ناکارہ ہوگئی ہے یا امریکہ کے ساتھ ملی بھگت کرلی ہے۔ اس میں سے کون سی بات ہے؟

ان کا وقار مجروح ہوا تھا، انٹلی جنس اور فوجی اہلکاروں نے جواباً میڈیا پر ہی دھاوا بول دیا، اور وہی طریقے استعمال کیے جس پر وہ ہمیشہ سے انحصار کرتے رہے ہیں: دہشت پیدا کرنا یا "ملکیت"، یعنی صحافیوں کی وفاداری خرید لینا یا رسائی کے ذریعے وفاداری کی ترغیب دینا۔ مصنف اور صحافی، CPJ کے بورڈ ممبر احمد راشد نے بتایا، "میڈیا میں آئی ایس آئی کے اثر و نفوذ کی ایک طویل روایت ہے جس کی تاریخ 30 سال پرانی ہے اور اس نے جنرل ضیاء الحق کے عہد میں ایک بڑے پیمانے پر یہ کام شروع کیا تھا۔"مشرف کے دور میں آزاد الیکٹرانک میڈیا کو اجازت ملنے سے یقینی طور پر انٹلی جنس ایجنسیوں کے سامنے ایک چیلنج پیدا ہوگیا ہے کیونکہ بڑی تعداد میں ٹی وی اسٹیشنوں کی شروعات ہوگئی ہے۔ لیکن وہ پورے ٹی وی نیٹ ورک میں کسی نہ کسی طریقے سے گھس جانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔"

تو ایبٹ آباد کے مظاہرے کے بیچ، ایجنسی نے بھروسے مند نیوز اینکروں کو بے رحم امریکہ مخالف لائن کی معلومات فراہم کیں۔ ایک سیاسی تجزیہ نگار نے کہا کہ پاکستان فوج کے سربراہ اشفاق کیانی نے آئی ایس آئی کو وفادار اخباری میڈیا کے ساتھ کھڑے ہونے کی اجازت دی۔ شناخت ظاہر نہ کرنےکی شرط پر بات کرتے ہوئے تجزیہ نگار نے بتایا کہ کیانی کے لحاظ سے، یہ فوج کا وقار مجروح ہونے کا معاملہ تھا۔ "وہ بنیادی طور پر ایسے شخص ہیں جو سب سے زیادہ وقار پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ وقار کے خبط میں مبتلا ہیں۔ ان کا تعلق ایک ایسی برادری سےہے جہاں وقار کیلئے ہلاک ہوجانا زیادہ معنی رکھتا ہے۔ آئی ایس آئی کے سربراہ کو بھی اسی طرح تحریک ملی تھی۔ "پاشا نے میرے ایک دوست کو بتایا، جب انہوں نے اسامہ کو مارا تو ہمیں کافی غصہ آیا۔ ہمارا دماغ اڑ گیا، ہم کافی ناراض تھے۔"

ہر اخبار اور ٹی وی اسٹیشن میں کوئی شخص ایسا ہوتا ہے جو یا تو آئی ایس آئی اور فوج کے نقطۂ نظر کا ہمدرد ہوتا ہے، یا قیمت لے کر ہمدرد بننے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ بہت سارے پاکستانیوں کو ان کا نام معلوم ہے۔ آئی ایس آئی کی میڈیا ونگ پسندیدہ اینکروں، مذاکروں کے سربراہان، اور اخبار کے مدیروں کو بلاتی ہے اور انہیں بتاتی ہے کہ کس لائن پر چلنا ہے۔ مثلاً، جب کیری لیوگر ایکٹ 2009 اپنایا گیا تھا تو سیکیورٹی کا ادارہ برہم ہوگیا تھا کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ امریکی فنڈ فوج کے ہاتھوں سے گزرے بغیر براہ راست شہری حکام کے پاس جاسکتے تھے۔ یوں تو بیشتر پاکستانی عوام کو قانون میں مذکور باتوں کا بہت معمولی سا اندازہ تھا، مگر اینکروں اور مذاکرات کے سربراہان کو فوج کی میڈیا ونگ میں لاکر انہیں اسے ملکی مفاد کے برخلاف ہونے کی وجہ بتائی گئی۔ تقریباً فوری طور پر فضائی لہریں کیری - لیوگر ایکٹ کے تنقیدی پروگراموں سے بھر گئی تھیں۔

میڈیا کی وفاداری حاصل کرنے کیلئے دیگر طریقے بھی استعمال ہوتے ہیں: مثال کے طور پر، بہت سارے پاکستان شہروں میں "میڈیا کالونیز" ہیں جہاں حکومت رعایتی شرحوں پر صحافیوں کیلئے زمین مخصوص کرتی ہے۔ ایک آزاد، پہلے سے زیادہ باحوصلہ پریس دنیا میں کسی بھی جگہ جوڑ توڑ والے پریس سے باہمی طورپر مستثنی نہیں ہے - اور پاکستان میں تو یقیناً

نہیں ہے۔ جیسا کہ پاکستان میں موجود ایک امریکی اہلکار نے بتایا: یہ ایک سازشی میڈیا، لیکن قابل ذکر حد تک آزاد ہے۔ فی الوقت اردو اخبارات میں وہ اسلام آباد میں امریکہ کے ذریعے ایک چھاؤنی تعمیر کرنے اور امریکی سفارتخانے میں چھپاکر رکھے گئے 300 مرین کے بارے میں ڈراؤنی کہانیاں شائع کرتے ہیں"! بات بس اتنی ہی نہیں ہے، بلکہ اردو پریس اور میر نے بھی اپنے ٹی وی شو پر پاکستان میں کام کر رہے امریکیوں پر جاسوس ہونےکا الزام عائد کیا ہے، حتی کہ ان کے پتے بھی درج کیے ہیں۔

بڑے نیٹ ورک ایک تخمینی توازن کا ایکٹ لاگو کرتے ہیں۔ لہذا بطور مثال، جنگ گروپ کے چیف ایکزیکیٹو میر شکیل الرحمان فوج کو جیو ٹی وی پر اپنے اینکروں کو جھلانے کی اجازت دیں گے، لیکن وائس آف امریکہ کے آدھے گھنٹے کے سلاٹ کے ساتھ امریکی جشن کی پیروی کریں گے۔ اوپن سوسائٹی فاؤنڈیشن کے سنٹرل یوریشیا پروجیکٹ کے ساتھ پاکستان کی بابت سینئر مشیر، فیصل باری کا کہنا ہے، "یہ ایک گیم ہے جو آپ مستقل طور پر کھیلتے ہیں نیز جس چیز کو تسلیم کرنا ہے اسے سامنے رکھتے ہوئے آپ کس قدر اثر و رسوخ رکھتے ہیں اور کس قدر حاصل کرسکتے ہیں۔"

اہم ٹاک شوز میں روز افزوں طور پر، آزاد مشرب آوازیں ختم کی جا رہی ہیں، ان کی جگہ ریٹائرڈ جنرلوں اور دائیں بازو کے دیگر پنڈتوں کو لایا جا رہا ہے۔ آج جیو ٹی وی فوج کی جانب ازانہ کوششوں کی تائید کرنے والے یا محض وطن پرستی والے گیتوں کو نشر کرنے والے پروگراموں کے ساتھ سیٹھی اور میر کے پروگراموں کا توازن بنانے میں احتیاط برت رہا ہے – یہ دونوں ہی مستقل طور پر فوجی ادارے کی نکتہ چینی اور ان کی خامیوں کو آشکارا کرتے رہتے ہیں۔ جیو نے گزرتے سالوں کے ساتھ اپنے مالی سبق یاد کرلیے ہیں۔ مشرف کی ماتحتی میں نیٹ ورک کو محض چند مہینوں کیلئے بند کیا گیا تھا۔ صدر آصف علی زرداری کی ماتحتی میں، 2011 میں حکومت نے جیو کے اسپورٹس چینل کےلائسنس کودو بار کالعدم قرار دینے کی کوشش کی تھی، یہ ایک ایسا قدم تھا جس کو اگر سپریم کورٹ کے ذریعے مسدود نہیں کیا گیا ہوتا تو اس پر اسٹیشن کا لاکھوں کا صرفہ آتا۔ یوں تو حکومت نے باضابطہ طور پر اس منسوخی کیلئے "سیکیورٹی کلیئرنس" کی کمی کی بات کہی تھی، لیکن ہر کوئی سمجھ گیا تھا کہ زرداری حکومت صدر پر جیو کے مستقل حملے کا بدلہ لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ ۔ زیادہ تر میڈیا اور حکومت ایک دوسرے کے ساتھ زندہ رہنے کا طریقہ تلاش کرتے ہیں۔ اور یہ صورت حال اس وقت تک رہتی ہے جب تک کوئی حد سے نہ گذر جائے۔

ایک طویل مدت سے دی *فرائی ڈے ٹائمس* کے مدیر اعلیٰ اور جیو پر آنے والے اپنے خود کے پروگروم کے میزبان جناب سیٹھی نے کبھی تعلقات کی بنا پر، کبھی مزاح کی آڑ میں، کبھی منظر پر بہت واضح رہ کر، اور کبھی بڑی ہمت دکھا کر کئی مواقع پر خود کو جسمانی اذیت سے بچایا ہے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جہاں انھوں نے کسی حساس نکتے، جیسے ادلیہ، پر انگلی رکھی اور جیو نے ان کی آواز کاٹ دی گئی۔ اس کے بعد 2007ء سے ان کو موت کی دھمکیاں مل رہی تھیں، پہلے دوسرے صحافیوں کے برخلاف طالبان کو جنگجو کے بجائے دہشت گرد کہنے پر طالبان نے ان کو دھمکایا اور بعد میں آئی ایس آئی نے۔ انٹیلی جنس آفسر یا تو ان پر غضب ناک ہوے یا اپنے آقاؤں کا پیغام ان تک پہنچایا کہ اس بات کے عام ہونے پر کہ بن لادن کی کمین گاہ ایبٹ آباد تھی، جو پاکستانی راجدھانی سے زیادہ دور نہیں ہے، ان کا پروگرام فوج اور آئی ایس آئی کی نکتہ چینی کرنے میں حد سے بڑھ گیا ہے۔

2 مئی 2011 کو، سیٹھی نے اس چھاپے کے بارے میں ایک پروگرام پیش کیا جس میں ان کے بقول آرمی جنرل یا تو ملوث تھے یا پھر وہ ایسے لائق نہیں تھے۔ یہ اس وقت کے آئی ایس آئی کے سربراہ پاشا کے ساتھ ایک ہنگامی ملاقات کا سبب بنا، جس میں دونوں نے ایک دوسرے پر حب الوطنی کا غلط استعمال کرنے کاالزام دھرا۔ اس کے فورا بعد ہی مہران بحریہ کے اڈے پر حملہ کیا گیا تھا، اوراسلام آباد میں صحافی شہزاد کو اغوا کرلیا گیا تھا۔ چند دنوں کے بعد اذیت سے دوچار ان کی لاش ایک نہر میں پڑی ہوئی ملی تھی۔ سیٹھی نے نشر کرتے ہوے الزام لگایا تھا کہ اس اغوا او رہلاکت کے پیچھے آئی ایس آئی موجود ہے۔ سیٹھی نے لاہور میں اپنے گھر سے مجھے بتایا "سلیم نے اغوا ہونے سے قبل مجھ پر اور پاکستان میں ہیومن رائٹس واچ کے نمائندہ علی دیان حسن، اور آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی کے سربراہ حمید ہارون جیسے لوگوں پر اعتبار کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ آئی ایس آئی کی وجہ سے سخت مشکل میں ہیں اور انہیں خوف ہے کہ ان کے ساتھ بے رحمانہ برتاؤ کیا جاسکتا ہے۔"

شہزاد کے قتل کے بعد، سیٹھی نے بھی رات والے اپنے ٹاک شو کے متعدد پروگراموں کو فوج میں القاعدہ کی گھس پیٹھ کے نام منسوب کیا، اور اہلکاران اس کی طرف سے آنکھیں بند کیے رہے – یہ ایسا موضوع تھا جس کا انکشاف شہزاد نے *ایشیا ٹائمز آن لائن* کیلئے اپنے کالموں میں پہلی بار کیاتھا۔ ایک سینئر وزیر نے جس کی نشاندہی سیٹھی رسمی طور پر نہیں کی تھی اس صحافی کو مشورہ دیا تھا کہ اگر انہیں اپنی سلامتیس کی پرواہ ہے تو پیچھے ہٹ جائے۔

آئی ایس آئی سیٹھی کے ساتھ غضبناک تھی، حالانکہ وہ اس ایجنسی پر شہزاد کی ہلاکت کا الزام لگانے والے واحد شخص نہیں تھے۔ سیٹھی کے معاملے میں فرق یہ ہے کہ وہ مسلسل اور اشتعال انگیز ہیں اور رات دیر گئے چلنے والا ان کا پروگرام انتہائی مشہور پروگراموں میں سے ایک ہے۔ انہیں"غائب" ہوجانے کا بھی جامع تجربہ ہے۔ بلوچ سورش میں سیٹھی کی شمولیت کیلئے انہیں 1970 کی دہائی کے دوران لمبے عرصے تک قید رکھا گیاتھا۔ 1999 میں، پاکستانی حکومت میں بدعنوانی کے بارے میں بی بی سی کے ساتھ ایک انٹرویو کے بعد، سیٹھی کو ان کے گھر سے زبردستی گھسیٹ کر لایا گیا اور حکومت سے غداری کے الزامات میں محبوس کرکے رکھا گیا۔

"میں سات مہینے تک ان کی قید میں رہا اور میں جانتا ہوں کہ یہ چیزیں کس طرح پیش آتی ہیں۔ میں بے یار و مددگار تھا ایک فٹبال کی طرح جس کو ایک پوچھ تاچھ سے دوسری کیلئے لے جایا جاتا تھا ISI—MI، اسپیشل برانچ — اور مجھے پتہ چلا کہ لوگوں کو کس طرح لے جایا جاتا ہے اور کیا ہوتا ہے اور یہ بھی جان لیا کہ کس کو مار ڈالا جاتا ہے ۔" لہذا پیچھے ہٹ جانے کی ان کی تنبیہوں کے بعد بھی، سیٹھی شہزاد کے قتل میں آئی ایس آئی کی شمولیت کے اپنے الزامات پر ڈٹے رہے بلکہ اس سے بھی آگے نکل گئے۔ انہوں نے بتایا "ان کا مقصد صرف انہیں مارنا پیٹنا اور سبق سکھانا تھا۔ آئی ایس آئی مطلب پرست ہو سکتی ہے لیکن وہ لوگوں کو حوالات میں بے فضول نہیں مارتے ۔ میں نے اس پورے واقعے کو دوبارہ مرتب کیا جو شاید پیش آیا تھا۔ میں نے کہا کہ سلیم کی موت شاید اس کی پسلیوں کے زخموں کے بوجھ کی وجہ سے سانس نہ لے پانے کے سبب ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ لوگوں کو اٹھا لیا جاتا ہے ان کے منھ میں کپڑا ٹھونس دیا جاتا ہے اور آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے، اور انہیں کسی گٹھر یا بوری میں ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ سب سے پہلے تو خوف پیدا کرکے آپ کا اعتماد ڈگمگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب ان کا شکار کسی نامعلوم جگہ پر پہنچتا ہے تو، اسے فرش پر ڈال دیا جاتا ہے۔ پھر لاتیں مارنے اور چیخ پکار کی شروعات ہوتی ہے۔ یوں تو الٹی سیدھی لاتیں چلتی ہیں ۔ سر اور پسلیوں میں لاتیں ماری جاتی ہیں۔ لاتیں پسلیوں کے بالائی حصے پر پڑتی ہیں۔ میں نے کہا کہ آٹوپسی کیے جانے کے بعد ہمیں اس طرح کی اذیت دینے کے ثبوت تلاش کرنےچاہیے۔ چار دن بعد آٹوپسی رپورٹ نے بتایا کہ چھٹی اور

دسویں یا بارہویں پسلی ٹوٹی ہوئی تھی اورٹوٹی ہوئی پسلیوں نے پھیپھڑوں میں چھید کر دیے تھے۔جنھوں نے یہ اذیت پہنچائی تھی وہ اس کام میں ماہر نہیں تھے۔"

حیرت انگیزحد تک تو نہیں مگر، فوج اور انٹلی جنس سیٹھی کی تفصیل سےپریشان تھی۔ سیٹھی نے بتایا "شہر میں موجود ہر اس صحافی نے، جس کا رشتہ ان لوگوں سے تھا، کہا کہ وہ تم سے بے حد ناراض ہیں۔ اور اس کے بعد بھی انہوں نے شہزاد کی موت میں انکوائری کمیشن کا مطالبہ کر ڈالا۔ حکومت نے انکار کردیا۔ لہذا وہ ٹی وی پر ظاہر ہوئے۔ "میں نے کہا 'میں میڈیا سے حکومت اور فوج کی خبروں کا بائیکاٹ کرنے کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ سیٹھی نے بتایا، ہم ایک انکوائری کمیشن کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر کمیشن قائم نہیں کیا گیا تو ہم انٹر سروسز کے تعلقات عامہ کی خبریں یا پریس کے بیانات نہیں چھاپیں گے۔ چند دنوں کے بعد حکومت نے ایک جج کی سربراہی میں ایک کمیشن کے قیام کا اعلان کیا جس میں پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے ایک صحافی بطورنمائندے کےشامل تھے۔ پھر سیٹھی نے انکوائری کمیشن میں فوج کے حامی بیوروکریٹوں کی شمولیت کی نکتہ چینی کی، جس نے فوج کو مزید بھڑکا دیا۔

اس کمیشن کا مقصد صرف شہزاد کے اغوا اور قتل کے پس منظر اور حالات کی چھان بین کرنا نہیں تھا بلکہ مجرموں کی نشاندہی کرنا بھی تھا۔ اس کے بجائے، متعدد صحافیوں، ہیومن رائٹس واچ، پولیس، اور آئی ایس آئی کی گواہیاں لینے کے بعد، تیار شدہ رپورٹ میں کہا گیا کہ دہشت کی اس جنگ میں کتنے ہی اداکار ہیں جن میں سے کسی نے شہزاد کو قتل کر دیا ہوگا۔

سیٹھی نے بتایا، "اس ملک کے لگ بھگ ہر مشہور صحافی نے اس کمیشن کی رپورٹ کو مسترد کردیا، جس میں آئی ایس آئی کو بری قرار دے دیا گیاتھا اور سبھی کلیدی سوالات غیر حل شدہ رہ گئے تھے۔ خاص طور پر کمیشن نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مجرموں کی نشاندہی نہیں ہوسکتی ۔"

آخر کار وزارت داخلہ نے سیٹھی اور ان کے اہل خانہ کے خلاف دھمکیوں کے سلسلے میں پولیس اور انٹلی جنس ایجنسیوں کیلئے ایک مشاورت نامہ جاری کیا۔ جس میں حکومت کو پولیس گارڈز فراہم کرنے کو کہا گیا۔ پھر بھی سیٹھی نے اعلی درجے کے مآخذ سے یہ سمجھ لیا کہ ان کا نام مرنے والوں کی فہرست میں شامل ہے اور انہیں ملک چھوڑدینا چاہیے۔ سیٹھی اور ان کی بیوی جگنو محسن نے 2011 میں واشنگٹن میں نیو امریکا فاؤنڈیشن میں سینئر فیلو کی حیثیت سے تین مہینے گزارے۔ سیٹھی کے دور رہنے کے عرصے میں ہی،ایک معتبر ذریعے نے ان کے گھر پر فون کیا اور انہیں مزید کچھ وقت کیلئے گھر سے دور رہنے کی تنبیہ کی۔ ان کو فوج سے قربت رکھنے والی ایک جہادی تنظیم کے ذریعے پلاٹ کے بارے میں بتایا گیا تاکہ انہیں، نیز نکتہ چینی کرنے والے دو اور صحافیوں، خالد احمد اور امتیاز عالم کو ہلاک کردیا جائے، یہ دونوں ہی ساؤتھ ایشیا فری میڈیا ایسوسی ایشن کیلئے کام کرتے ہیں، جو ہندوستان کیلئے دوستی اور امن کی وکالت کرنے کے سبب فوج کی بدنام فہرستوں میں شامل ہیں۔ لیکن سیٹھی نے واپسی کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے امریکہ کا اپنا دورہ مختصر کیا اور پاکستان لوٹ آئے، اور اپنے آبائی شہر سے اپنے پہلے ٹی وی شو میں انہوں نے کہا کہ انہیں "ریاستی اور غیر ریاستی عناصر کے ذریعے دھمکیاں دی گئی تھیں" اور یہ بھی کہا "اگر میرے ساتھ یا میرے اہل خانہ کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو فوج کی اعلی قیادت اس کیلئے ذمہ دار قرار دی جائے گی۔"

کئی مہینے تک، وہ اپنے گھر سے بہت ہی خاص موقعوں پر خطرہ مول لے کر نکلتے تھے اور بڑے انکسار سے مقامی

کانفرنسوں میں شرکت کرنے اور تقریر کرنے سے معذرت کر لیتے تھے۔ ان کا گھر پوری طرح سے مسلح سپاہیوں، الارم سسٹم، اور نگرانی کرنے والے کیمروں سے لیس ہے۔ سیٹھی خاندان نے ایک بکتر بند گاڑی لے لی ہے۔ جیو نے ان کے گھر ہی پر ایک اسٹوڈیو بنا دیا تھا جہاں سے وہ حالات حاضرہ پر ہفتے میں تین بار پروگرام نشر کرتے تھے۔ لیکن دھمکیاں بدستور جاری رہیں اور سیٹھی کے پروگرام بھی۔ موسم بہار 2012 میں، سیٹھی نے سلسلہ وار اسٹوریاں پیش کیں جس نے فوج اور آئی ایس آئی کی برائیوں کا پردہ چاک کیا، جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ مشرف اور اب کیانی کی ماتحتی میں شروع ہونے والے جاسوسوں نے ایک ایسی فوج پر غلبہ حاصل کرلیا ہے جو اچھی طرح منظم اور کمر بستہ رہا کرتی ہے۔ ایک اعلی مرتبت وزیر نے جن کا نام سیٹھی نہیں لیں گے انہیں تنبیہ کی کہ حکومت کو پتا چل رہا ہے کہ سیکیورٹی ادارہ برہم تھا۔ ایک تبصرہ کرتے ہوئے، وزیر موصوف نے سیٹھی سے کہا کہ حکومت آپ کو کھونا نہیں چاہتی ہے اور، آپ کو تو پتہ ہے کہ طاقت کا سرچشمہ کہیں اور ہے۔" یہ بات حقیقت ہے، لیکن ایک اعلی مرتبت سرکاری اہلکار سے یہ بات سننا تکلیف دہ امر ہے۔

حملے دوسرے گوشوں سے بھی کیے گئے۔ "آئی ایس آئی سے قربت رکھنے والے صحافی مجھ پر مستقل طور پر پرنٹ میڈیا میں اور انٹرنیٹ پر امریکہ کے پٹھو ہونے کا الزام لگا رہے ہیں" وہ کہتے ہیں، یہ ایک ایسا الزام ہے جو حد درجہ با اختیار ماحول میں تشدد کی تحریص کو بڑھاوا دیتا ہے۔ "یہ 1999 میں اس وقت میرے ساتھ پیش آمدہ معاملے کا اعادہ ہے جب میں نے نواز شریف کی حکومت میں اعلی ترین سطح پر بدعنوانی کا انکشاف کرنے کی مہم چلائی تھی۔ حکومت نواز میڈیا نے مجھ پر 'ہندوستانی ایجنٹ' ہونے کا الزام لگایا اورمجھے مبینہ غداری کے جرم میں جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ سپریم کورٹ کے ذریعے مجھے رہا کیے جانے کے بعد، حکومت کی گندی چالبازیوں والے محکمے نے مجھے ہراساں کرنے کے واسطے انکم ٹیکس کی حیلہ بازی کے درجنوں جھوٹے معاملات میں پھنسایا۔ مشرف حکومت نے سبھی معاملات واپس لے لیے اور انکم ٹیکس کے جن افسران نے نواز شریف حکومت کی ایما پر یہ کام کیا تھا بعد میں میرے پاس آئے اور مجھ سے معذرت بھی کر لی۔ اس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف نے بھی ایسا ہی کیا اور کہا کہ ایک "گمراہ کن" ساتھی کی وجہ سے وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ آج مجھے آئی ایس آئی کے اشارے پر اسی طرح کی ایذا رسانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اور انکم ٹیکس محکمے پر بھی مجھے ہراساں کرنے کا دباؤ پڑ رہا ہے۔"

حامد میر ٹیلی ویژن پر نمودار ہونے والے انتہائی مشہور چہروں میں سے ایک ہیں، اور ان کی اپیل کے ایک جزء نے ہی انہیں واقعی اس قدر چوکنا کردیا ہے۔ وہ ایک بالیاقت شومین ہیں اور انہوں نے ہر دور میں ذرائع کی آبیاری کی ہے۔ ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے جب انہوں نے اسامہ بن لادن کے ساتھ ایک انٹرویو کیا تھا ان پر آئی ایس آئی سے کافی قریب ہونے کا الزام لگایا گیا تھا — اور کس طریقے سے وہ اس طرح کی کاری ضرب لگا سکتے تھے؟ آج کل انہیں جنگجوؤں کا ہمدرد اور زرداری کا قریبی مانا جاتا ہے۔ ان کی سیاسی سمجھ بوجھ جو بھی ہو، وہ فضا میں ایک اچھی لڑائی کا مزہ اٹھاتے ہیں۔

2007 کے اواخر میں، مشرف کے خلاف وکلاء کی تحریک کے دوران، خود جنرل کے ذریعے میر پر چار مہینوں کیلئے جیو سے پابندی لگا دی گئی تھی۔ آئین کو دوبارہ نافذ کرنے اور اسے برقرار رکھنے کا مطالبہ کرنے والے چیف جسٹس افتخارمحمد چودھری اور وکیلوں کو مشرف کے ذریعے معزول کردیے جانے کے بعد والے سال کے مارچ میں اس تحریک کی شروعات

ہوئی۔ میڈیا (بشمول میر) نے اس تحریک کی حمایت کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ میر اپنے شو کو سڑک پر لے آئے، اسٹریٹ پروگراموں کا اہتمام کیا اور کافی بھیڑ جمع کرلی۔ 2009 میں، انہوں نے طالبان کے اندر سے رپورٹنگ کرکے فوج کو غضبناک کردیا – جس نے مبینہ طور پر انہیں اغوا کرلیاتھا اور پھر انہیں اپنی کہانی بیان کرنے دیا۔ پھر ان کے ساتھی موسا خان خیل کو ہلاک کردیا گیا۔ انہوں نے خان خیل اور شہزاد دونوں ہی کے معاملے میں کہا تھا "یہ واضح ہوگیا کہ اگر آپ کو ہلاک کردیا جاتا ہے تو، کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

2011 میں، انہوں نے بلوچستان کا معاملہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ بڑھتی گھس پیٹھ کے ساتھ، گمشدہ بلوچوں کے اہل خانہ نے اسلام آباد میں پارلیمنٹ کے پورے پارک میں اورکراچی میں پریس کلب کے باہر کیمپ لگائے، کہ کہیں تو ان کے معاملے کی سماعت ہوسکے۔ پاکستان میں واقع بڑے بڑے میڈیا آؤٹ لیٹس کے ذریعے بلوچستان کی جنگ کو وسیع پیمانے پر نظر انداز کردیا گیا۔ بی بی سی کے صحافی اور ناول نگار حنیف نے اس پر لکھا: "رپورٹ دینا مشکل ہے۔ ایجنسیاں نہیں چاہتی ہیں کہ ان کی رپورٹ پیش کی جائے۔ یہ نیٹ ورک نہیں چاہتا ہے کہ پنجاب آفس – مطلب اسلام آباد میں واقع حکام – پر دھاوا بولا جائے، "اور بلوچستان کی جانب سے کوئی ایسی تشہیر نہیں ہو رہی ہے لہذا وہ اس کا لحاظ نہیں کرتے ہیں۔ لیکن شاید خوف اس میں سب سے بڑا عامل ہے۔" انہوں نے مزید کہا کہ جیسے ہی بی بی سی بلوچستان پہنچتاہے، "انٹلی جنس ان کے پیچھے پیچھے پہنچ جاتی ہے، انہیں روکتی ہے، اور انہیں واپس بھیج دیتی ہے۔ حتی کہ کسی کے اغوا ہوجانے یا ہلاک ہوجانے کے بنیادی حقائق کی اطلاع دینا بھی روز افزوں طور پر خطرناک ہے۔"

تب بھی میرنے بلوچستان کے بارے میں ایک شو کیا۔ حفاظتی وجوہ کی وجہ سے ایک مختصر سی غیر حاضری کے بعد میر کے اس ملک میں واپس آنے کے فوراً بعد ہی اسلام آباد میں ان سے جب میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے بتایا "نوعمر افراد ایک خود مختار وطن کے خواہاں ہیں، لیکن عمر رسیدہ افراد کا کہنا ہے کہ 'ہم پاکستان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے ۔ اگر ہم علاحدہ ہوجاتے ہیں تو ہم ایران یا افغانستان کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ بہتر ہے کہ ہم اپنے حقوق کیلئے لڑیں۔'" ایک بلوچ لیڈر نے کہا کہ پاکستان فوج حقیقتاً پنجابی فوج ہے۔ لہذا میر نے اپنے شو میں دو پنجابی اراکین پارلیمان کے سامنے یہ بیان لائیو پیش کیا۔ "ان کا کہنا تھا، 'ہاں ان کا کہنا ٹھیک ہے۔' شو کے بعد مجھے ایک ٹکسٹ مسیج موصول ہوا۔ 'ہم سڑک پر تمہاری پٹائی کریں گے۔ فوج کا ایک افسر تمہیں سبق سکھائے گا۔ تم کو ننگا کردیا جائے گا۔'" یہ قطعی طور پر وہی معاملہ ہے جو 2010 میں عمر چیما کے ساتھ پیش آیا تھا، لہذا میر نے یہ پیغام انہیں آگے بڑھا دیا۔ اگلے دن چیما نے یہ پوری کہانی *دی نیوز* میں شائع کردی۔ یہ شو جلد ہی پارلیمان میں ایک گرما گرم مدعا بن گیا، نیز قومی اسمبلی کے حزف اختلاف کے قائد چودھری نثار علی خان نے خود کو بھی ایسی ہی دھمکیاں ملنے کا دعوی کیا۔

ایک اور کمیشن کی تشکیل ہوئی۔ صدارتی انجن چست ہوگیا۔ تب کے وزیر داخلہ رحمان ملک نے میر کو فون کیا اور نمبر و پیغام فارورڈ کرنے کو کہا۔ انسپکٹر جنرل آف پولیس کو طلب کیا گیا۔ زرداری نے فون کیا۔ ملک نے دوبارہ فون کیا اور سیکیورٹی کیلئے انہیں دو درجن پولیس لینے پر راضی کرنے کی کوشش کی، جو میر کے بقول انہیں خوفزدہ کرنے کی ایک پیشکش تھی۔ "میں کوئی ہندوستانی ایجنٹ نہیں ہوں اور اگر میں اسی اعلی درجے کا ہدف ہوں تو پھر وہ مجھے تحریری طور پر کیوں نہیں مطلع کرتے ہیں؟"

آخر میں، میر نےایک پولیس گارڈ گھر پر اورایک گارڈ دفتر میں لے لیا۔
پھر جنوری 2012 میں، وزارت داخلہ کے ذرائع نے انہیں بتایا کہ جن فون نمبروں سے انہیں دھمکی آمیز پیغامات بھیجے گئے

تھے وہ آئی ایس آئی کے ممبروں کے ہیں۔ اس طرح کے ثبوت کے باوجود، میر کے خلاف عوامی الزام اور بھی عجیب ہو گئے تھے ۔ ایجنسی نے دعوی کیا کہ وہ سی آئی اے کا ایجنٹ تھا اور حقیقتاً انہوں نے خود اپنا ہی فون ہیک کرکے یہ محسوس کرایا گویا انہیں آئی ایس آئی سے پیغامات موصول ہوئے ہیں۔

میر نے آخرکار یہ مدعا چھوڑ دیا اور دوسری رپورٹنگ کی سمت بڑھ گئے۔ انہوں نے گمشدہ افراد کے ان اہل خانہ کے بارے میں ایک شو کیا جنہوں نے پارلیمان کے سامنے کیمپ لگایا تھا۔ ایک عمر دراز خاتون نے اپنے تین بیٹوں کو مردہ یا زندہ واپس لانے کیلئے سپریم کورٹ میں ایک عرضی دائر کی تھی۔ انہیں جیل سے ان لوگوں نے اغوا کیا تھا جن پر عدالت میں آئی ایس آئی کے ساتھ ہونے کا الزام لگایا گیا تھا۔ ایک بیٹے کی موت ہوگئی تھی۔ کچھ وقت کے بعد دیگر دونوں بیٹوں کو عدالت میں پیش کیا گیا، ان کی ماں کی موت ہوگئی ہے۔ ملزمین جب عدالت میں پیش ہوئے تو میر نے ان اغوا کاروں کا ڈھکا ہوا چہرہ دکھایا، اور انہوں نے ٹیلی ویژن پر ان کی شدید نکتہ چینی کی۔

شو کے بعد زرداری نے میر کو فون کیا۔ میر کی یاد کے مطابق وہ بات چیت یوں ہوئی تھی:

"آپ آگ سے کھیل رہے ہیں۔ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتا ۔ اگر آپ کو ہلاک کردیا گیا تو یہ میری حکومت پر ایک اور برا داغ ہوگا۔"
"مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میر نے ان سے پوچھا۔
"محتاط رہیں۔" زرداری نے کہا۔
"کون مجھے ہلاک کرنا چاہتا ہے؟"
"مجھے نہیں معلوم۔"
"سر، میں سمجھتا ہوں کہ آپ پاکستان کی مسلح افواج کے سپریم کمانڈر ہیں۔"
"سمجھنے کی کوشش کریں!" زرداری چیخ پڑے۔

صدارتی دفتر نے میر کی بتائی گئی اس گفتگو پر تبصرہ کرنے کی CPJ کی درخواست پر کوئی جواب نہیں دیا۔

میر نے اپنے شو جاری رکھے۔ اگلا شو یونس حبیب کے ساتھ ایک خصوصی انٹرویو تھا، وہ ایک بینکر تھے اور بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے اور انہوں نے اس بات کا انکشاف کرنے کا فیصلہ کیا تھا کہ 1990 کی دہائی میں آئی ایس آئی نے کس طرح سیاست میں ساز باز کرنے کیلئے پاکستانی فوج کی چشم پوشی کے ساتھ ٹیکس دہندگان کی رقم میں خرد برد کی۔ یہ اسٹوری مہران گیٹ اسکینڈل میں ایک اہم موڑ تھی، جس نے ایک سابق آرمی چیف آف اسٹاف اور آئی ایس آئی کے ایک ڈائرکٹر جنرل کو پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا جس میں دونوں فریقوں نے ایک دوسرے پر بدعملی کے الزامات لگائے۔

شو کے فوراً بعد ہی میر کو ملک چھوڑ دینے کا مشورہ دیا گیا، اور آخر کار انہوں نے ایک ہفتے کے اندر ملک چھوڑ دیا۔ لیکن جیسا کہ میر نے مجھ سے بتایا، اگر انہیں اس قسم کی انتہائی ڈرامائی، تشہیر یافتہ پریشانیاں درپیش ہوسکتی ہیں تو، تصور کریں کہ عوام کی نگاہوں سے ماوراء وفاقی لحاظ سے زیر انتظام قبائلی علاقوں، وزیرستان، بلوچستان میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔

'اگر مجھے کچھ ہو جائے'

اپنے قتل سے سات ماہ قبل، *ایشیا ٹائمز آن لائن* کے نامہ نگار سلیم شہزاد کو انٹر سروسز انٹیلی جنس ڈائریکٹوریٹ کے میڈیا ونگ کے ڈائریکٹر جنرل ریئر ایڈمرل عدنان نظیر سے ملاقات کے لیے بلوایا گیا تھا۔ شہزاد نے کہا کہ 17 اکتوبر 2010 کی اس ملاقات میں ان پر ایک ایسے مضمون کی تردید کرنے کے سلسلے میں دباؤ ڈالا گیا تھا جسے یہ ادارہ اپنے لیے باعث شرمندگی سمجھتا تھا، اور ان سے اس مضمون کے لیے معلومات مہیا کرنے والوں کے نام افشا کرنے پر اصرار کیا گیا تھا۔

شہزاد نے یہ باتیں ماننے سے انکار کر دیا تھا پر وہ وہاں سے خطرے کا احساس لیے لوٹے۔ انہوں نے اس ملاقات کے بارے میں نوٹ درج کیے اور اگلے روز انہیں بذریعہ ای میل نظیر کو بھجوا دیا۔ شہزاد نے اس کی کاپیاں ہیومن رائٹس واچ کے نمائندے علی دیان حسن اور آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی کے سربراہ حمید ہارون کو بھی بھیجیں اور کہا کہ یہ نوٹ سنبھال کر رکھیں " اگر مجھے کچھ ہو جائے۔"

یہ نظیر کو بھیجے گئے ای میل کا متن ہے جسے شہزاد کے قتل کی باضابطہ تحقیقات میں بطور شہادت پیش کیا گیا تھا:

مزید حوالے کے لیے:

آئی ایس آئی کے اسلام آباد ہیڈ کوارٹر میں ISI کے DG برائے میڈیا ونگ، ریئر ایڈمرل عدنان نظیر اور سید سلیم شہزاد، بیورو چیف پاکستان برائے ایشیا ٹائمز آن لائن (ہانگ کانگ)، کے مابین 17 اکتوبر 2010 کو ہونے والی ملاقات کی تفصیلات۔ اس گفتگو کے دوران ISI میڈیا ونگ کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل، کموڈور خالد پرویز بھی موجود تھے۔

موضوع ملاقات: ایشیا ٹائمز آن لائن کے مضمون، بعنوان 'پاکستان نے طالبان کمانڈر کو رہا کردیا'، مطبوع 15 اکتوبر 2010، پر گفتگو (دیکھیے
(http://atimes.com/atimes/South_Asia/LJ16Df02.html

اس ملاقات میں مندرجہ ذیل مسائل زیر بحث لائے گئے۔

1- سید سلیم شہزاد نے ریئر ایڈمرل عدنان کو بتایا کہ اس مضمون کی معلومات انٹیلی جنس کے ایک ذریعے سے باہر نکلیں۔ تاہم انہوں نے کہا کہ اس مضمون کو تب شائع کیا گیا جب طالبان کے ایک مستند ترین وسیلے سے اس کی تصدیق ہو گئی۔ سید نے یہ وضاحت بھی کی کہ DG ISPR کو اس مضمون کے بارے میں ایک ٹیکسٹ میسج بھیجا گیا تھا مگر انہوں نے اس کا جواب نہ دیا۔

2- ریئر ایڈمرل عدنان نظیر کی رائے میں یہ مضمون ملک کے لیے بہت شرمندگی والی بات تھی تاہم ان کا کہنا تھا کہ حکومت کی جانب سے اس کی تردید، اس کا حل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے تجویز

پیش کی کہ سید سلیم شہزاد کو اس مضمون کے رد میں لکھنا چاہیے۔

3- سید شہزاد نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا اور اسے ناقابل عمل قرار دیا۔

4- ریئر ایڈمرل عدنان متجسس تھے کہ اس مضمون کے لیے کس نے معلومات فراہم کی ہیں، کہ اتنے اہم اور نمایاں انٹیلی جنس ادارے کے دفتر سے معلومات باہر نکلنا قابل افسوس ہے۔

5- سید شہزاد نے اسے انٹیلی جنس کی جانب سے معلومات افشائی قرار دیا لیکن اس مخصوص ذریعے کی نشاندہی نہیں کی جس نے یہ معلومات دیں۔

6- یہ گفتگو نہایت شائستہ اور دوستانہ ماحول میں ہوئی اور اس کمرے میں کسی بھی وقت گھما پھرا کر بات نہیں کی گئی۔ ریئر ایڈمرل عدنان نظیر نے سید سلیم شہزاد کو مندرجہ ذیل الفاظ میں ایک مشورہ دیا ۔
"میں آپ کوایک مشورہ دیتاہوں ۔ ہم نے حال ہی میں ایک دہشت گرد کو گرفتار کیا ہے اور پوچھ تاچھ کے دوران اس سے ڈھیر ساری معلومات، ڈائریاں اور دیگر مواد دریافت کیا ہے۔ اس کے پاس ایک ہٹ لسٹ ہے ۔ اگر مجھے اس فہرست میں آپ کا نام ملا تو میں آپ کو بتا دوں گا۔"

شہزاد نے اپنے *ایشیا ٹائمز آن لائن* کے مدیر ٹونی ایلیسن کو ایک الگ ای میل لکھا جس میں اسی قسم کے الفاظ میں ملاقات کا حال بیان کیا گیا تھا۔ تاہم، سرکاری تحقیقی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق، ایلیسن کو بھیجے گئے 17 اکتوبر کے ای میل میں ان کے خدشات کا زیادہ واضح اظہار موجود تھا۔ شہزاد نے کہا کہ ان کے نزدیک نظیر کے الوداعی کلمات "قتل کی دھمکی" تھے۔

کمیشن کو اپنا بیان دیتے ہوئے نظیر نے تسلیم کیا کہ انہیں شہزاد کا ای میل موصول ہوا تھا، لیکن انہوں نے اس بات کی تردید کی کہ وہ آخری کلمات انھوں نے کہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے شہزاد کو جواب نہیں دیا کیونکہ ان کے خیال میں یہ "مناسب" نہ تھا۔

نتیجۂ کلام

بہت کم واقعات نے پاکستان بھر کے صحافیوں کو یوں متحرک کیا ہے جیسا کہ مئی 2011 میں ہونے والے سلیم شہزاد کے قتل نے۔ ایک مختصر وقت کے لیے ان صحافیوں کی طاقت کو بطور ایک "یونین" کے محسوس کیا گیا۔ انہوں نے ایک تحقیقی کمیشن قائم کروایا۔ انہوں نے ISI کے ان افسران کے نام گنوائے جنہوں نے شہزاد اور بہت سے دیگر صحافیوں کو دھمکایا تھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں پیش آنے والی صورتحال کی تفصیلات ایک عوامی ریکارڈ میں درج کیں جو انٹرنیٹ پر مہیا ہے۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی رپورٹ میں بعض سلسلہ وار، امید کن، تجاویز پیش کی گئی ہیں، جن کے کچھ حصے مندرجہ ذیل پیش کیے جا رہے ہیں:

- ۔ ۔ ۔ کہ ملک کے تمام اداروں میں عوام کا اعتماد بحال کرنے کے مقصد سے، انٹیلی جنس اکٹھی کرنے کے طرز عمل میں رازداری اور جواب دہی کے درمیان پائے جانے والے تناسب میں مناسب ترمیم کی جائے گی؛
- "کہ زیادہ اہمیت کے حامل انٹیلی جنس کے اداروں کو ۔ ۔ ۔ ایسے قوانین کے ذریعے جو ان کے مخصوص اختیارات اور ذمہ داریوں کو بہت احتیاط سے واضح کریں، قانون کا زیادہ پابند بنایا جائے؛ کہ ذرائع ابلاغ کے ساتھ ان کی بات چیت کو احتیاط سے، ادارے بھر میں ایک موثر نظام کے پابند کیا جائے اور باقاعدگی سے درج کیا جائے؛
- "۔ ۔ ۔ کہ، اس سلسلے میں، محتسب برائے انسانی حقوق کا فارم تشکیل دیا جائے تاکہ ایجنسیوں کے خلاف شہریوں کی شکایتوں کی قانونی چارہ جوئی کی جا سکے، بالخصوص ذرائع ابلاغ کی جانب سے انہیں ڈرانے، ہراساں کرنے اور نقصان پہنچانے کی کوششوں کے خلاف ملنے والی شکایتیں؛
- "کہ اسلام آباد اور پنجاب کی پولیس ان تمام افراد سے باز پرس کر کے، جو کوئی بھی افراد موجودہ واقعے کے سلسلے میں عام حالات میں زیر تفتیش آنے چاہییں، اس معاملے کی تفتیش مستعدی، اور غیر جانبداری سے بغیر کسی خوف و انعام کے جاری رکھے ۔ ۔ ۔"

تاہم، پاکستان کے آزادانہ ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کو بنانے میں معاون اور پاکستان میں انسانی حقوق کے ممتاز وکلاء میں شامل، حنا جیلانی نے، جنہیں اقوام متحدہ کی جانب سے دنیا بھر میں حقائق تلاش کرنے کے لیے بھیجے جانے والے وفود میں تعینات کیا جا چکا ہے، کہا کہ "یہ تجاویز سینکڑوں مرتبہ پیش کی جا چکی ہیں۔" وہ ان تمام صحافیوں کے جذبات کے عکاس ہیں جن سے میں نے اس رپورٹ کے سلسلے میں بات کی۔ "یہ تجاویز نہایت غیر واضح نوعیت کی ہیں،" جیلانی نے کہا۔ "یہ تفتیش کے لیے کسی راہ کا تعین نہیں کرتیں۔" در حقیقت، کمیشن نے خود ہی کہا ہے کہ انٹیلی جنس کے اداروں کو مزید جواب دہ ٹھہرانا، ایگزیکٹیو اور پارلیمان پر منحصر ہے اور یہ کمیشن محض اتنا ہی کر سکتا ہے کہ اصلاح کے لیے تجاویز پیش کرے۔ تاہم اس رپورٹ کے اختتام میں فصیح و بلیغ زبان میں پاکستانی پریس کی تاریخ اور ایک آزادانہ پریس کی طرف سے حکومت کو جواب دہ ٹھہرانے کی عالمگیر ضرورت کو ضرور پیش کیا گیا ہے۔ پھر اپنی عدم استطاعت کو تسلیم کرتے ہوئے، رپورٹ کے مصنفین لکھتے ہیں: "اس تحقیقی کمیشن کا مجرموں کی نشاندہی کرنے میں ناکام رہنا، درحقیقت، ایسے 'پراسرار' واقعات کو حل کرنے کے سلسلے میں، ہمارے عدالتی نظام کی مستقبل کی صلاحیت کے بارے میں بھی ایک بڑا سوال بن کر ابھرتا ہے۔"

جیسا کہ *دی فرائڈے ٹائمز* کے مدیر اور جیو ٹی وی کے میزبان نجم سیٹھی نے کہا: "اس کمیشن کو تامل کے ساتھ قائم کیا گیا تھا۔ اس نے ISI کو محفوظ رکھنے کے لیے، حقیقت پر پردہ ڈالنے کا کام کیا۔"

آزاد اور طاقتور عدالتی نظام کے بغیر – یا ایک ایسے عدالتی نظام کے بغیر جو کم از کم فعال ہی ہو – پریس والے متحدہ قومی موومنٹ، انٹر سروسز انٹیلی جنس ڈائریکٹوریٹ اور طالبان جیسے ظالمانہ عناصر یا کسی بھی ایسے گروہ کے رحم و کرم پر ہیں جو تشدد کو اپنا آلۂ کار بناتا ہے۔ بدقسمتی سے پولیس، ججوں ، وکلاء، اور تفتیش کاروں سمیت، عدلیہ کے (تمام شعبوں میں) مالی فراہمی کی کمی ہے، تحفظ مہیا نہیں، اور بہت سی صورتوں میں وہ خوف کے مارے MQM پر ہاتھ ڈالنے کی جرات نہیں رکھتی، اور یہی حال ISI، فوج، اور فرقہ وار دہشت گردوں کے معاملے میں ہے۔ کراچی کے وہ سرکاری وکلاء جنہوں نے چھ پاکستان رینجرز کے خلاف ایک نہتے شہری کے قتل کا مقدمہ جیتا تھا اب اپنی نوکریوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں اور ان کے پاس اپنے گھر والوں کی کفالت کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ان کو مقرر کرنے والی حکومت ان کی طرفداری نہیں کر رہی کیونکہ حکومت بھی فوج اور انٹیلی جنس کے زیر احسان ہے، اور اس کے لیڈران کو بہت احتیاط سے اس بات کا تعین کرنا ہوتا ہے کہ وہ اپنے زیادہ طاقتور برادران سے کب ٹکر لیں۔ وہ شاذ ہی ایسا کرتے ہیں۔

انٹیلی جنس کے اداروں کو اگر شہزاد کے قتل کا کوئی نتیجہ بھگتنا پڑا تو بس اتنا ہی کہ آئندہ انہیں زیادہ احتیاط کرنا ہوگی کہ ان کے کام کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ یہ درست ہے کہ طالبان کے ترجمان احسان اللہ احسان نے دعوی کیا تھا کہ وہ مکرم خان عاطف کے قتل کے ذمہ دار ہیں، تاہم علاقے کے صحافیوں کو اس بات کا یقین نہیں ہے کہ طالبان، ایجنسی کی مداخلت کے بغیر ہی کاروائی کر رہے ہیں۔ پاکستان نے ابھی تک بھارت اور افغانستان سے جنگ میں دہشت گردوں کو بطور اثاثہ اپنے ساتھ رکھنے کی پالیسی تبدیل نہیں کی ہے۔ اور جب ایک بار طالبان کسی قتل کی ذمہ داری لے لیتے ہیں تو تفتیش کی ضرورت نہیں رہتی۔ ولی خان بابر کے کیس میں مشتبہ افراد پر الزامات عائد کیے گئے تھے، لیکن اکثر گواہوں کو قتل کر دیا گیا ۔ MQM اتنی طاقت اور رسوخ رکھتی ہے کہ کراچی میں قریبًا کوئی بھی صحافی اپنے خدشات یا شکوک کے بارے میں بیان نہیں دے گا۔ حتی کہ طالبان سے بھی اتنی دہشت زدگی نہیں محسوس کی جاتی۔

ISI اور MQM اپنے پرتشدد ہتھکنڈوں کے باعث اس رپورٹ میں زیادہ باعث توجہ رہے ہیں۔ صحافیوں کے لیے یہ ان خوفناک ترین عفریتوں میں سے ہیں جو کبھی جسمانی طور پر اور کبھی نفسیاتی طور پر راستہ روکے کھڑے رہتے ہیں۔

ملک میں کافی ہفتے گزارنے کے بعد میں نے سکیورٹی کے اہلکار، ایک کرنل، سے بات کی جو ISI کی جانب سے غیر ملکی میڈیا سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ صرف اس شرط پر بات کرتے ہیں کہ ان کا نام صیغہ راز میں رکھا جائے۔ میں نے ان سے ان دھمکیوں کے بارے میں پوچھا جو شہزاد کے خیال میں انہیں (شہزاد کو) ریئر ایڈمرل عدنان نظیر کی جانب سے مل رہی تھیں، جن کے بارے میں (شہزاد) نے اپنے مدیر اور دوسروں کو بتایا تھا۔ "آپ اس کا کچھ بھی مطلب لے سکتے ہیں،" ان سرکاری اہلکار نے نظیر کے متعلق شہزاد کے بیانات کو غیر اہم گردانتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس میں دھمکی دینے والی بات نظر نہیں آتی۔"

جب میں نے ان سے ان الزامات کا جواب دینے کو کہا جن کے مطابق شہزاد، عاطف، موسا خانخیل، اور جان اللہ ہاشمزادہ کے قتل کے پیچھے ISI کا ہاتھ ہے، تو انہوں نے ان الزامات کو جھوٹا کہہ کر رد کر دیا۔ جب میں نے ان سے کہا کہ صحافیوں نے ISI کے ایجنٹوں کے ہاتھوں ڈرائے جانے اور ہراساں کیے جانے کے بارے میں بیان دیے ہیں، تو وہ غصے میں آ گئے۔ انہوں

نے مجھ پر ISI کے خلاف جانبدارانہ رویہ اختیار کرنے کا الزام لگایا۔ اور انہوں نے مجھے "گبلز کے نظریے" کے بارے میں متنبہ کیا کہ "کہ ایک جھوٹ اتنی دفعہ بولا جائے کہ وہ سچ بن جائے۔" چاہے وہ ایک ایسے فرد کا کردار ادا کر رہے تھے جس پر غلط الزام لگا دیا گیا ہو یا چاہے وہ حقیقی غم و غصہ ظاہر کر رہے تھے، ان کے بعد کے بیانات باعث انکشاف تھے – اس سلسلے میں بھی کہ جو کچھ ISI کے طالبان کے ساتھ تعلق کے بارے میں کہا جاتا ہے، اور اس ادارے کی عملی پالیسیوں اور ان مقاصد کے درمیان پائے جانے والے نہایت بڑے تضاد کے سلسلے میں بھی جو مقاصد یہ ادارہ اپنے ملک کے حق میں چاہنے کا دعوی کرتا ہے۔

وہ حامد میر اور نجم سیٹھی کی طرف سے کی جانے والی شکایتوں پر کہ ISI انہیں دھمکاتی ہے، برس پڑے۔ "ان صحافیوں کا مقصد کیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔ "وہ ان کوششوں کی بےقدری کیوں کرنا چاہتے ہیں جو ISI نے اس جنگ کو لڑنے میں کی ہیں؟" اور انہوں نے کہا، "ہمارے پاس ان لوگوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ ہم ایسے لوگوں کے ساتھ جنگ میں مصروف ہیں جو میرے بیٹوں اور بیٹیوں اور بھائیوں کو قتل کر رہے ہیں۔ کیا میرے اعمال ہر کسی پر، یا کسی ایک شخص پر بھی، یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں کہ میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کی کوششوں میں پرخلوص ہوں اور میں اپنے ملک سے اس مصیبت کے خاتمے کے لیے اپنی ہر ممکن طاقت لگا دوں گا؟ میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے اور میرے بچوں کے بچے ایک ایسے ملک میں رہیں جہاں دائیں، بائیں، ہر طرف، بم پھٹ رہے ہوں، اور 40,000 لوگ خودکش حملوں اور IED سے ہلاک ہو چکے ہیں، اور ہماری فوج کے 150,000 سپاہی ایک مسلسل جنگ لڑنے میں لگے ہوئے ہیں!" انہوں نے امریکہ اور ان 48 دیگر ممالک کو برا بھلا کہا جن پر افغانستان کی انٹرنیشنل سکیورٹی اسسٹنس فورس مشتمل ہے۔ انہوں نے کہا کہ، ان ممالک کا دعوی ہے کہ وہ امن کے قیام کے لیے آئے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ہی اس علاقے میں آگ لگا رکھی ہے – اور پھر اس کی تمام ذمہ داری پاکستان پر ڈال دی ہے۔ انہوں نے غیر ملکیوں کی شکایتیں دہرائیں: "پاکستان میں چھپنے کے محفوظ ٹھکانے ہیں۔ پاکستان حقانیوں کو تحفظ دے رہا ہے۔ کوئٹہ شوری [طالبان قیادت] پاکستان میں ہے۔" اور پھر وہ مزید غم و غصے سے بھر گئے۔ "آج بھی پینٹاگان کی رپورٹ میں یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں چھپنے کے محفوظ ٹھکانوں کے باعث افغانستان کو امن اور استحکام حاصل نہیں ہو پا رہا ہے۔ اپنی تمام تر ٹیکنالوجی کے ساتھ، اور لڑائی کے ہر قسم کے اصول و قواعد سے آزاد رہ کر بھی، امریکی ابھی تک دہشت گردوں کو، یا نام نہاد دہشت گردوں کو، قابو کرنے میں ناکام رہے ہیں؟"

پھر انہوں نے بات کو ایک اور موڑ دیا اور کہا، ٹھیک ہے، پاکستان میں طالبان کے محفوظ ٹھکانے موجود ہیں۔ "چلیں بالفرض میں نے مان لیا کہ حقانی پاکستان میں میری حفاظت میں ہیں،" انہوں نے کہا۔ پھر انہوں نے شمالی وزیرستان کے صدر مقام میران شاہ سے، جہاں حقانی موجود ہیں، افغان سرحد کی جانب (20 کلومیٹر) اور پھر کابل تک (270 کلومیٹر) کے فاصلے کا حساب لگایا۔ "کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ISI اتنی طاقتور ہے کہ وہ ان کو افغانستان تک تحفظ دے سکتی ہے؟ جلال الدین" – حقانیوں کا سردار – "بڑھاپے سے سٹھیا چکا ہے۔ سراج" – اس کا بیٹا – "یہ جنگ لڑ رہا ہے۔ اور جہاں تک میرے علم میں ہے وہ مہینے کے 20 دن افغانستان میں گزارتا ہے۔ جو کام آپ لوگ خود افغانستان میں نہیں کر سکتے، آپ کا کہنا ہے کہ ہم کو یہاں کرنا چاہیے؟"

ان میں سے ہر بیان اپنے ساتھ بہت سے الجھاؤ لیے ہوئے ہے۔ ایک طرف وہ اشارہ کر رہے ہیں کہ شاید پاکستان نے "آپ کے دشمنوں" کو پناہ دے رکھی ہے۔ دوسری طرف ان کا کہنا ہے کہ "آپ" حقانی کو تب کیوں نہیں پکڑ لیتے جب وہ افغانستان میں داخل ہوتا ہے جہاں "آپ کے" سپاہی موجود ہیں – جیسے یہ کوئی چوہے بلی کا کھیل ہو۔ مگر چلیں اس

بات کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ وہ اپنی اصل بات کی طرف آ رہے تھے جو طالبان کے لیے پاکستانی حمایت کی حقیقی اغراض میں سے ایک ہے۔ انہوں نے کہا کہ اصل مسئلہ چھپنے کی پناہ گاہوں کا نہیں ہے۔ افغانستان کا مسئلہ پاکستان نہیں ہے۔ "یہ مسئلہ اس تمام پشتون قوم کا ہے جسے آپ [مغربی ممالک] نے اپنے اقدامات کے باعث الگ کر دیا ہے۔" انہوں نے کہا کہ امریکہ، حامد کرزئی کے نام پر ایک غلط پشتون کو لے آئی – "حتی کہ پشتون بھی کرزئی کو بطور پشتون قبول نہیں کرتے" – اور بقیہ افغان حکومت تاجک، ہزارہ، اور ازبیک افراد پر مشتمل ہے۔ اور یہ ہے وہ مرکزی وجہ جو پاکستانی قیادت کے تحت افغانستان میں ہونے والی بغاوت کے پیچھے پائی جاتی ہے۔

کیا یہ بات باعث حیرت ہے کہ پاکستانی صحافیوں کو ملنے والی دھمکیوں کے بارے میں گفتگو، پاک امریکہ "اتحاد" اور افغان جنگ پر مدلل مکالمے کی صورت اختیار کر جائے؟ نہیں۔ درحقیقت، اس سے پاکستانی صحافیوں کو درپیش مشکل بےنقاب ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ انہیں ایک ایسے ملک کے ساتھ واسطہ ہے جو فی الحقیقت سکیورٹی کے نظام کے زیر اقتدار چل رہا ہے – ایک ایسا نظام جو خود کو اپنے ہمسایہ ممالک اور امریکہ کی جانب سے خطرے میں محسوس کرتا ہے – اور جو دراصل ان تمام کے ساتھ متصادم ہے۔ میر اور سیٹھی جیسے بعض صحافیوں کے پاس اتنا رسوخ، اندرونی تعلقات، اور بین الاقوامی حمایت موجود ہے کہ وہ آواز بلند کریں اورکسی نہ کسی طرح بچ پائیں۔ تاہم ثانوی حیثیت رکھنے والوں کو تلف کرنے میں قباحت نہیں محسوس کی جاتی، یہ ثانوی حیثیت کے افراد دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ میں ظلم کا نشانہ بنتے ہیں۔

پاکستانی صحافی اکثر مغربی خبر رساں تنظیموں کے ساتھ کام کرتے ہیں، جیسے شہزاد کرتے تھے۔ عاطف کی طرح بعض، ایسے ذرائع ابلاغ کے لیے براہ راست کام کرتے ہیں جن کی فنڈنگ امریکی حکومت کرتی ہے۔ اور مغربی میڈیا کو مغربی حکومتوں کے لیے ایک قسم کے جاسوسی کرنے اور پراپگینڈا پھیلانے کے ذریعے کے طور پر دیکھا جاتا ہے – یعنی، پاکستانی سکیورٹی کے نظام کے دشمن کے طور پر۔

صحافی تب تک غیر محفوظ رہیں گے جب تک پاکستان کی خود سے جنگ جاری رہے گی، جس میں وہ یہ فیصلہ نہ کر پائے کہ وہ جہادیوں سے لڑ رہا ہے یا انہیں برے وقتوں کے لیے بچا کر رکھنا چاہتا ہے، جس میں وہ یہ فیصلہ نہ کر پائے کہ وہ سنّیوں کی ایک مسلمان ریاست ہے یا ایک ایسی جمہوریت ہے جو سنّی، شیعہ، احمدی، مسیحی، اور چھوٹے طبقے کے نسلی گروہوں کے ساتھ رواداری سے پیش آئے گی۔ کیا یہ شہری جمہوریت ہے یا جمہوریت کے پیچھے چھپی فوجی ریاست ہے؟ کیا یہ ایک محدود پنجابی طبقے کا فوجی اقتدار ہے؟ یا ایک ایسی جگہ ہے جہاں سندھی، بلوچ، پشتون، ہزارہ، تمام (قوموں) کے لیے جگہ ہے؟ جنوری 2013 کے پہلے ہفتوں میں کوئٹہ میں، ہزارہ شیعہ اکثریت پر مبنی ایک علاقے میں بم حملوں سے تقریباً 100 لوگ ہلاک ہوئے تھے۔ ان بم دھماکوں کی رپورٹنگ کرنے والے تین صحافی بھی ہلاک ہو گئے تھے۔ لشکر جھنگوی نے دعوی کیا کہ وہ اس کا ذمہ دار ہے۔ فوج نے نہ کچھ کیا اور نہ کچھ کہا۔ ہزارہ افراد نے سڑکوں پر قطار در قطار میّتیں بچھا دیں اور مطالبہ کیا کہ فوج علاقے کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ملک میں ہزاروں پاکستانیوں نے احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ انتہا پسند تنظیموں کے خلاف کارروائی کی جائے۔ اس تحریر کو درج کرنے تک، کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی ہے۔

پاکستان کو درپیش مسائل –بشمول وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم، معیشت پر فوجی غلبہ، بدعنوانی، سزاؤں سے معافی، قرض، دہشت گردی، فرقہ وارانہ قتل – اس قدر وسیع ہیں کہ ان کے لیے ایک غیر معمولی بصیرت کے حامل لیڈر کی

ضرورت ہے اور ایک ایسی حکومت کی جو مطلق العنان سکیورٹی فورسز سے ٹکر لینے پر راضی ہو۔ حکومت سے جواب دہی کا مطالبہ کر کے صحافی، سب سے اہم ذمہ داریوں میں سے ایک ادا کر سکتے ہیں۔ وہ عدلیہ کے ساتھ غیر رسمی تعلقات قائم کر چکے ہیں، مگر انہیں خود سے مزید پ یش قدمیاں کرنے کی ضرورت ہے، مثلاً متنبہ کرنے والا SOS نیٹ ورک، ایسے لوگوں کو سمعی بصری نشریات اور طباعت کے صفحات میں جگہ نہ دینے کا عہد جو ان کے ساتھیوں کو دھمکاتے ہیں، اور اخباروں، ٹی وی سٹیشنوں، اور انٹرنیٹ کے ذرائع کی جانب سے یہ عہد کہ حفاظت کو منافع پر مقدم رکھا جائے گا۔

CPJ کی تجاویز

CPJ کی جانب سے پاکستانی حکام، پاکستانی نیوز میڈیا، اور عالمی برادری کو مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

برائے حکومت پاکستان:

- ان تمام افراد کی مکمل طور پر تفتیش کر کے مقدمہ چلایا جائے جو مکرم خان عاطف اور ولی خان بابر کے قتل کے ذمہ دار ہیں، بشمول ان سب کے جو بابر کے کیس کے گواہوں اور تفتیش کاروں کے قتل کے ذمہ دار ہیں۔ ان واقعات کی تفتیش کے لیے مناسب وسائل، سیاسی حمایت، اور تحفظ فراہم کیا جائے۔ ان اقدامات سے ظاہر ہوگا کہ تمام افراد اور ادارے قانون کے جواب دہ ہیں۔
- گزشتہ دہائی میں، حل نہ ہونے والے، صحافیوں کے قتل کے دیگر 21 مقدمے بھی دوبارہ کھولے جائیں۔ مکمل طور پر تفتیش کی جائے، تمام ذمہ داران کو گرفتار کیا جائے، اور کامیابی سے مقدمے چلائے جائیں۔ ایسا کرنے سے ظاہر ہوگا کہ ملک قانون کی بالادستی کے بارے میں سنجیدہ ہے۔
- صحافیوں پر حملوں کے سلسلے میں ہونے والی تمام سرکاری تفتیش کے نتائج عوام کے سامنے لائے جائیں۔ بالخصوص، حیات اللہ خان کے قتل کے سلسلے میں ہونے والی سرکاری تفتیش کے نتائج عام کیے جائیں، جنہیں ملکی سکیورٹی کے ایک حساس معاملے پر رپورٹنگ کرنے کے بعد 2006 میں قتل کر دیا گیا تھا۔
- پولیس اور پراسیکیوٹروں کو مناسب عملہ، مالی امداد، اور تربیت فراہم کی جائے۔ قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں پر سیاسی دباؤ ڈالنے کے رواج کو ختم کیا جائے۔ انٹیلی جنس کے اداروں اور حکومت کے دیگر تمام اختیارات کو، قانون نافذ کرنے والوں کو ہراساں کرنے اور ان پر دباؤ ڈالنے کی کوششوں کو، روکنے پر مرکوز کیا جائے۔
- ملکی انٹیلی جنس کے اداروں کے لیے، سلیم شہزاد کے قتل کے تحقیقی کمیشن کی تجاویز کے مطابق قانونی ڈھانچہ نافذ کیا جائے۔ کمیشن کا کہنا تھا کہ اس کا مقصد ان اداروں کو، "اندرونی انتظامی جائزوں اور پارلیمان کی نگرانی پر مشتمل مناسب طور پر تشکیل دیے گئے نظام کے تحت زیادہ جواب دہ بنانا ہے۔"
- شہزاد کمیشن کی تجویز کے مطابق، ایک محتسب بنایا جائے جو کسی بھی فرد کی طرف سے انٹیلی جنس کے افسران اور ایجنٹوں کی بدعملی یا بدعملی ہونے کے شک کی شکایت کے حل پر کام کرے۔ کمیشن نے تلقین کی کہ نیوز میڈیا کی شکایتوں کو "خاص سنجیدگی سے لیا جانا چاہیے۔"
- صحافیوں کے تحفظ کے لیے دوسرے ممالک میں لی جانے والی پیش قدمیوں کو بطور نمونہ اپنانے پر غور کیا جائے۔ اس میں میکسکو کی طرف سے کیے جانے والے اقدامات بھی شامل ہیں جہاں صحافیوں کے خلاف ہونے والے جرائم کو وفاقی حیثیت دے دی گئی ہے اور آزادئ اظہار کے خلاف ہونے والے جرائم کے لیے وفاقی سطح پر خصوصی سرکاری وکیل کا دفتر قائم کیا گیا، اور کولمبیا، جہاں دھمکائے جانے والے صحافیوں کو براہ راست سکیورٹی فراہم کی جاتی ہے۔
- اقوام متحدہ کے ایکشن پلان آن سکیورٹی آف جرنلسٹس اینڈ ڈی اشو آف امپیونٹی کے تحت فروغ دیے جانے والے پروگراموں کی تشکیل اور ان کو نافذ کرنے میں مکمل تعاون کیا جائے۔ اپنے ان وفود کے ذریعے جو اقوام متحدہ کو تعینات ہیں، آگے بڑھنے کے منصوبوں کے لیے درکار مالی فراہمی اور دیگر وسائل کی حمایت کی جائے۔

- قبائلی علاقوں میں نجی براڈکاسٹ کے لائسنس جاری کرنے کے لیے درکار قانونی ڈھانچہ تشکیل دیا جائے۔ ایسے معیار قائم کیے جائیں جو ملک کی باقی جگہوں پر نافذ- شرائط کے مطابق ہوں، اور لائسنس بروقت جاری کیے جائیں۔
- بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کی بلوچستان اور قبائلی علاقوں تک رسائی کو یقینی بنایا جائے۔

برائے پاکستانی ذرائع ابلاغ:

- اس پیشے سے متعلق ہر شعبے میں حفاظتی تربیت کو وسیع اور مضبوط کیا جائے۔ یہ تربیت، خبروں کے چھوٹے بڑے ہر ادارے میں موجود صحافیوں کو، نیز 'فری لانس' صحافیوں کو، فراہم کی جانا چاہیے۔ اس لائحہ عمل سے منسلک، مقامی اور بین الاقوامی NGO کے ساتھ مل کر کام کریں۔
اس پیشے میں ہونے والے تعاون کی موجودہ کوششوں کو وسیع اور مضبوط کریں اور یہ یقینی بنائیں کہ تمام کلیدی پیشہ ورانہ گروہوں کی نمائندگی ہوگی۔ ذرائع ابلاغ پر حملوں اور اس کو ڈرانے، دھمکانے کی جوابی مذمت اور ان حرکتوں کے خلاف کارروائی کا مطالبہ متحدہ آواز سے کریں۔ حفاظت اور اخلاقیات کے مسائل کا سامنا کرنے والے صحافیوں اور خبروں کی تنظیموں کی معاونت کے لیے اس پیشے سے متعلق رہنمائی ہدایات تشکیل دینے اور فروغ دینے پر غور کریں۔ کولمبیا میں، مثال کے طور پر، خبروں تنظیموں متشدد تنازعات کو ڈھکنے کے لئے ہدایات تیار کیں ۔
- اقوام متحدہ کے ایکشن پلان آن سکیورٹی آف جرنلسٹس اینڈ ڈی اشو آف امپیونٹی کے تحت فروغ دیے جانے والے پروگراموں کی تشکیل اور ان کو نافذ کرنے میں مکمل تعاون کیا جائے۔
- انفرادی حملوں، دھمکیوں، اور ذرائع ابلاغ کو ڈرانے کے واقعات سمیت، پریس کے خلاف تشدد کے مسائل اور پاکستان کی طرف سے اقوام متحدہ کے ایکشن پلان کے نفاذ میں ہونے والی مجموعی ترقی کے بارے میں مطلع کریں۔
- صحافیوں کے لیے اعلی تعلیم حاصل کرنے کے مواقعوں کو فروغ دیں۔ اکثر یونیورسٹیوں میں میڈیا سٹڈیز یا کمیونیکیشن میں انڈرگریجویٹ یا گریجویٹ کورس پیش کیے جاتے ہیں، لیکن صحافت میں نہیں۔ ذرائع ابلاغ کے بڑے بڑے اداروں اور پیشہ ورانہ گروہوں کو بالخصوص، صحافت کے اردو اور انگریزی زبان کے اسکول قائم کرنے کو ترجیح دینی چاہیے اور معاونت فراہم کرنی چاہیے۔

برائے بین الاقوامی برادری:

- اقوام متحدہ کے رکن ممالک کو اقوام متحدہ کے ایکشن پلان آن سکیورٹی آف جرنلسٹس اینڈ ڈی اشو آف امپیونٹی کے لیے درکار مالی فراہمی اور دیگر وسائل کی حمایت کرنی چاہیے۔
- بین الاقوامی سطح پر معاونت کرنے والوں کو پاکستانی صحافیوں کی حفاظتی تربیت کے لیے مالی امداد اور ماہرین مہیا کرنا چاہیے۔ معاونت کرنے والوں کو ایسی پیش قدمیوں پر توجہ دینی چاہیے جو 'فری لانس' صحافیوں پر اور ذرائع ابلاغ کے درمیانے یا چھوٹے پیمانے کے اداروں کے لیے کام کرنے والوں پر مرکوز ہیں۔
- ذرائع ابلاغ کی بین الاقوامی تنظیموں کو یہ یقینی بنانا چاہیے کہ ان کے تمام مقامی صحافیوں کو حفاظتی تربیت مہیا کی جائے گی۔ ذرائع ابلاغ کے بین الاقوامی اداروں کو اپنے مقامی صحافیوں کو درپیش شدید خطرات کا باریک بینی سے جائزہ لینا چاہیے،

انہیں اپنی پالیسیوں پر ان خطرات کو پیش نظر رکھ کر نظر ثانی کرنی چاہیے، اور یہ یقینی بنانا چاہیے کہ فیلڈ میں کام کرنے والے صحافیوں پر یہ پالیسیاں پوری طرح واضح کر دی جائیں۔ امریکہ کے براڈکاسٹنگ بورڈ آف گورنرز کو ان منفرد خطرات پر خصوصی توجہ دینی چاہیے جن کا سامنا امریکی حکومت کی مالی معاونت سے چلنے والے خبر رساں اداروں کے لیے کام کرنے والے صحافیوں کو کرنا پڑتا ہے۔

ضمیمہ

2003-2012 میں ہلاک ہونے والے صحافی: محرک کی تصدیق ہوئی

CPJ ریسرچ نے یہ تعین کیا ہے کہ پاکستان میں یکم جنوری 2003 سے لے کر 31 دسمبر 2012 تک 42 صحافی براہ راست اپنے کام کے سلسلے میں ہلاک ہوئے ہیں۔ اسی عرصے میں مزید 12 صحافی مشتبہ حالات میں ہلاک ہوئے ہیں۔ میڈیا کے تین امدادی کارکنان بھی ہلاک ہوئے ہیں۔ کیپسول نے ذیل میں ہر ایک موت سے متعلق رپورٹیں پیش کی ہیں، اور اس کی شروعات ان کیسوں سے کی ہےجن میں CPJ نے کام سے وابستہ محرک کی تصدیق کی ہے۔

فضل وہاب، فری لانس،
21 جنوری 2003 منگورہ

ایک آزاد مصنف، وہاب کو نامعلوم بندوق برداروں نے اس وقت گولی ماردی تھی جب وہ شمال مغربی پاکستان کے مرکزی شہر منگورہ کے قریب، منگلوار بازار میں سڑک کے کنارے ایک دکان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دکاندار اور اس کے نوجوان معاون کی بھی اس حملے میں موت ہوگئی تھی۔

وہاب نے، جو منگورہ میں رہتے تھے، اردو اور پشتو میں کئی ایسی کتابیں شائع کی تھیں جن میں مقامی مذہبی لیڈروں اور اسلامی جنگجو تنظیموں پر نکتہ چینی کی گئی تھی۔ وہاب کی کتابوں میں ایک کتاب *ملّا کا کردار* بھی تھی، جس میں سیاست میں علمائے اسلام کی دخل اندازی کا تجزیہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے اسامہ بن لادن اور طالبان کے بارے میں بھی ایک مسودہ تیار کر لیا تھا۔

مقامی صحافیوں اور حقوق انسانی کے کارکنان نے CPJ کو بتایا کہ وہاب کو صحافت سے وابستگی کی بنا پر کئی برس سے دھمکیاں مل رہی تھیں۔ خود مختار حیومن دائٹس کمیشن آف پاکستان اس نتیجے پر پہنچا کہ قاتلوں کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس نے کوئی واضح کارروائی نہیں کی۔

ساجد تنولی، *شمال*
29 جنوری 2004، منشیرہ

پاکستان کے شمال مغرب کے سرحدی صوبے کے منسیرہ شہر میں جسے اب خیبرپختونخواہ کے نام سے جانا جاتا ہے، اردو زبان کے ایک علاقائی روزنامے *شمال* کے 35 سالہ رپورٹر کو قتل کر دیا گیا۔ ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کی باضابطہ رپورٹ کے مطابق ایک شاہراہ پر تنولی کی کار روک کر ان کو باہر نکالا گیا اور ان کو کئی گولیاں ماری گئیں۔

اخباری رپورٹوں میں بتایا گیا تھا کہ تنولی نے مقامی انتظامیہ کے سربراہ، خالد جاوید کے متعلق تنقیدی مضامین لکھے تھے، جس میں تین دن پہلے ہی شائع ہونے والی وہ تحریر بھی شامل تھی جس میں شراب کے ناجائز کاروبار میں انتظامیہ پر اس کی ملی بھگت ہونے کا الزام لگایا گیا تھا۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق پولیس نے جاوید کے خلاف قتل کا الزام لگایا تھا جس سے اسے فرار ہونا پڑا۔

پاکستان میں پریس مخالف حملوں کا مطالعہ کرنے والی صحافی کرن نازش کے مطابق جاوید واپس تو آگئے ہیں لیکن قتل کے الزامات پر پھر کبھی دوبارہ نظرثانی نہیں کی گئی۔

اللہ نور، خیبر ٹی وی
امیر نواب، ایسوسی ایٹڈ پریس ٹیلیویژن نیوز اور *فرنٹیئر پوسٹ*
7 فروری 2005، وانا

پشاور میں واقع خیبر ٹی وی کے ایک صحافی اللہ نور، اور ایسوسی ایٹڈ پریس ٹیلیویژن نیوز کے ایک فری لانس کیمرا مین اور *فرنٹیئر* پوسٹ کے رپورٹر امیر نواب کو شمالی وزیرستان میں بندوق برداروں نے گولی مار دی تھی۔ یہ صحافی اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ ایک بس میں سوار ہوکر ساراروگا قصبے سے واپس آ رہے تھے، جہاں انہوں نے مشتبہ قبائلی جنگجو بیت اللہ محسود کی خود سپردگی کی کوریج کی تھی۔

افغانستان کی سرحد سے لگے پاکستان کے قبائلی علاقوں کی سیکیورٹی کے سربراہ محمود شاہ کے حوالے سے دی ایسوسی ایٹڈ پریس نے بتایا کہ وانا شہر کے پاس لگ بھگ صبح 7:30 بجے ایک کار بس کے آگے نکلی اور حملہ آوروں نے AK-47 رائفلوں سے گولیاں چلا دیں تھیں۔ بس میں سوار دیگر دو صحافی بھی زخمی ہوگئے تھے۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق، اس حملے میں ایجنس فرانس پریس کے اسٹرنگر، انور شاکر کی پیٹھ میں زخم آئے۔ الجزیرہ کے لیے کام کرنے والے دلاور خان کو معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ نواب کو پیشہ ورانہ لحاظ سے میر نواب کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔

چند دنوں کے بعد، سپاہ اسلام نے اخباروں کو ایک خط فیکس کر کے اس قاتلانہ واردت کی ذمہ داری قبول کی۔ اس خط میں کچھ صحافیوں کو "عیسائیوں کے لیے کام کرنے" اور "مسلم مجاہدین کے خلاف...منفی پروپیگنڈہ میں آلہ کار کے بطور استعمال کیے جانے" کا ملزم قرار دیا گیا تھا۔

مقامی صحافیوں نے اہلکاروں پر قتل کی وارداتوں کے وقت زیادہ سرگرمی نہ دکھانے کا الزام لگایا۔ انہوں نے بتایا کہ بندوق برداروں کی گاڑی کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی حالانکہ حملے کی یہ واردات حکومت کے زیر اختیار علاقے میں پیش آئی تھی۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ قتل کی واردات کی کوئی حقیقی چھان بین بھی نہیں کی گئی۔

پاکستانی فوج نے شمالی وزیرستان میں القاعدہ کے مشتبہ جنگجوؤں کے خلاف 2004 کے اوائل میں جارحانہ طریقہ شروع کیا تھا۔

منیر احمد سانگی، کاوش ٹیلیویژن نیٹ ورک
29 مئی 2006، لاڑکانہ

مقامی میڈیا رپورٹوں کے مطابق، سندھی زبان کے ایک چینل کے کیمرامین سانگی کو اس وقت گولی مار دی گئی تھی جب وہ شمال مشرقی پاکستان کے صوبۂ سندھ کے لاڑکانہ شہر میں انار اور ابرو قبائل کے افراد کے مابین گولی باری کی کوریج کر رہے تھے۔ اس تصادم میں کم از کم ایک اور شخص ہلاک ہوا تھا، جس کی ریکارڈنگ سانگی نے مرنے سے قبل کی تھی۔ اسٹیشن نے ان کا ویڈیو نشر کیا تھا۔

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے مطابق، پولیس کا کہنا تھا کہ سانگی کی ہلاکت دو طرفہ فائرنگ میں ہوئی ہے، حالانکہ کچھ رفقائے کار کا ماننا ہے کہ جرگہ، یا انار قبیلہ کے سربراہوں کے ذریعے منعقدہ قبائلی کونسل کی اسٹیشن کے لیے رپورٹنگ کرنے کے سبب شاید انہیں جان بوجھ کر نشانہ بنایا گیا تھا۔ جرنلسٹ یونین کا کہنا ہے کہ سانگی کے چچا اور رفیق کار پر اسٹیشن کی ان رپورٹوں کے سلسلے میں حالیہ دنوں میں حملہ کیا گیا تھا جس میں قبائلی عدالت کے ذریعے دو بچوں کو سزا دی گئی تھی۔

جرنلسٹ یونین کے اس وقت کے سکریٹری جنرل مظہر عباس نے کہا کہ گولی مارے جانے کے بعد کئی گھنٹوں تک سانگی کی لاش دریافت نہیں ہو سکی تھی۔ لاڑکانہ کے صحافیوں اپنے رفیق کار کے قتل کے خلاف احتجاجی دھرنے پر بیٹھے۔

خود مختار پاکستان کے حقوق انسانی کمیشن نے کہا کہ ایک صوبائی وزیر، الطاف حسین انار کے ذریعے مبینہ بدسلوکی کی کوریج کے سلسلے میں سانگی کو دھمکیاں موصول ہوئی تھیں۔ سندھ ہوم ڈپارٹمنٹ نے بتایا کہ سانگی کی موت کے بعد چار لوگوں کو گرفتار کیا جا چکا ہے اور تین پولیس اہلکاروں کو بھی معطل کر دیا گیا ہے۔ انار کو 2008 میں ایک الگ معملے میں گرفتار کیا گیا تھا، لیکن سانگی کیس کے سلسلے میں ان پر کوئی الزام طے نہیں ہوا تھا۔

ہلاک ہونے والے صحافی کے بھائی ہادی سانگی اور CPJ کے ذریعے نظرثانی کردہ عدالتی دستاویزات کے مطابق ابتدائی گرفتاریوں کے باوجود مشتبہ افراد کو کبھی بھی مقدمے کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔ ہادی سانگی نے یہ بھی کہا کہ انہیں اور ان کے بھائی کی بیوہ، ریشماں سانگی کو بار بار دھمکیاں ملیں ہیں۔

حیات اللہ خان، فری لانس
16 جون 2006، میران شاہ

خان کی لاش شمالی وزیرستان کے شہر میران شاہ میں گاؤوں والوں نے دریافت کی تھی، جہاں انہیں چھ ماہ پہلے اغوا کیا گیا تھا۔ 5 دسمبر 2005 کو پانچ بندوق برداروں نے خان کو اغوا کرلیا تھا جنہوں نے ان کی کار سڑک سے نیچے اتار لی تھی جبکہ ان کے چھوٹے بھائی حسین اللہ بے بسی سے دیکھتے رہے۔ مقامی انتظامیہ کے اہلکاروں اور خاندان کے افراد نے بتایا کہ 32 سالہ خان کی لاش اس حالت میں ملی تھی کہ ان کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں تھیں اور انہیں کئی گولیاں ماری گئی تھیں۔ پاکستانی صحافیوں نے CPJ کوبتایا کہ ان کی لاش بوسیدہ معلوم ہوتی تھی اور مرنے سے پہلے آخری بار جب انہیں دیکھا گیا تھا اس لحاظ سے ان کی داڑھی بڑھ گئی تھی۔

خان نے اپنے اغوا ہونے سے ایک دن قبل امریکی میزائل کی واضح باقیات کی تصویر کشی کی تھی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یکم دسمبر 2005 کو میران شاہ کے ایک گھر پر گرا تھا، جس میں القاعدہ کی سنیئر شخصیت حمزہ ربیعہ کی موت ہوئی تھی۔ یہ تصاویر جو کھینچے جانے کے دن ہی یوروپین پریس فوٹو ایجنسی کے ذریعے وسیع پیمانے پر تقسیم ہوئی تھیں، پاکستانی اہلکاروں کی اس وضاحت کی تردید کرتی تھیں کہ ربیعہ کی موت گھر میں رکھے دھماکہ خیز مادوں کی وجہ سے ہونے والے دھماکے میں ہوئی تھی۔ بین الاقوامی میڈیا نے تصاویر میں نظر آنے والی باقیات کو ہیل فائر میزائل کے حصے کے طور پر شناخت کیا تھا، جو امکانی طور پر امریکی ڈرون سے داغا گیا تھا۔

خان کو، جو اردو زبان کے ایک روزنامہ *اوصاف* کے رپورٹر بھی تھے، پاکستانی سیکیورٹی فورسز، طالبان ممبروں اور مقامی قبائلیوں کی جانب سے اپنی رپورٹنگ کی وجہ سے اس سے قبل بھی متعدد دھمکیاں ملی تھیں۔

چھ ماہ تک ان کی گمشدگی کے دوران، سرکاری اہلکاروں نے خان کے اہل خانہ کو ان کے ٹھکانے کی متعدد اور اکثر متضاد معلومات فراہم کیں ، جیسے خان حکومت کی تحویل میں ہیں، جلد ہی رہا ہو جائیں گے؛ خان کو کچھ " بدمعاشوں" نے اغوا کرلیا ہے؛ انہیں وزیرستان کے مجاہدین نے اٹھا لیا ہے؛ انہیں راولپنڈی میں واقع ملٹری بیس میں بھیج دیا گیا تھا، اور پھر وہ کوہاٹ ایئربیس میں حراست میں ہیں۔

ہسپتال کے کارکنان نے خان کے رشتہ داروں کو بتایاکہ انہیں پانچ یا چھ گولیوں کے زخم آئے تھے اور ایک ہاتھ میں ایسی ہتھکڑی لگی تھی جو عموماً پاکستان کی انٹر سروسز انٹلیجنس ڈائرکٹوریٹ کے ذریعے استعمال کی جاتی ہے۔ امریکہ میں پاکستان کے سفیر، محمود علی درانی نے ہتھکڑیوں کی موجودگی کی رپورٹوں کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے مسترد کردیا اور کہا کہ ہو سکتا ہے ہتھکڑیاں حکومت کو بدنام کرنے کے لیے لگائی گئی ہوں۔ اس معاملے میں کوئی آٹوپسی جانچ نہیں ہوئی ۔

ہائی کورٹ کے جسٹس محمد رضا خان کی سربراہی میں ایک تفتیش کی گئی، لیکن نتائج کو عام نہیں کیا گیا۔ حیات اللہ خان کے اہل خانہ نے بتایا کہ جج یا دیگر تفتیش کاروں نے ان لوگوں کا انٹرویو نہیں لیا ۔ شمال مغربی صوبے کے گورنر علی محمد جان اورک زئی نے CPJ کو بتایا کہ عدلیہ سے وابستہ کسی شخص کے لیے اغوا ہونے یا جان کا خطرہ ہونے کے لحاظ سے شمالی وزیرستان زیادہ محفوظ نہیں ہے۔ CPJ نے بار بار رپورٹ جاری کرنے کا مطالبہ کیا اور 2011 میں صدر آصف علی زرداری کو براہ راست ایک درخواست بھی دی ۔ یہ رپورٹ فروری 2013 تک ایک راز بنی رہی۔

نومبر 2007 میں، خان کی بیوہ اپنے گھر کے سامنے ہونے والے ایک بم دھماکے میں ہلاک ہو گئی تھیں۔

محبوب خان، فری لانس
28 اپریل، 2007، چار سدہ

فوٹوگرافر خان کی موت انٹیریئر منسٹر آفتاب شیرپاؤ کو نشانہ بناکر کیے گئے خودکش بم حملے میں ہوئی تھی۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں، جس کو اب خیبر پختونخواہ کے نام سےجانا جاتا ہے، ایک سیاسی ریلی میں ہوئے اس حملے میں وزیر کو معمولی چوٹیں آئیں، لیکن 28 لوگوں کی جان چلی گئی۔ اس حملے میں تین دیگر صحافی بھی زخمی ہوے تھے۔

حال ہی میں اپنے صحافتی پیشہ وارانہ زندگی کی شروعات کرنے والے 22 سالہ خان نے مقامی اور قومی سطح کی مطبوعات کو تصویریں مہیا کرائی تھیں۔ مانا جاتا ہے کہ وہ اس وقت کام کر رہے تھے۔ بعد کی رپورٹوں میں بتایا گیا کہ بم مارنے والے کے بارے میں مانا جاتا ہےکہ وہ ایک نوعمر لڑکا تھا اوراس موقع پر سیکیورٹی کو نظر انداز کیا گیا تھا۔

نور حکیم خان، *ڈیلی پاکستان*
2 جون، 2007، باجوڑ

ڈیلی پاکستان کے نامہ نگار اور ٹرائبل یونین آف جرنلسٹس کے نائب صدر خان، شمال مغربی سرحدی صوبہ، جس کو اب خیبر پختونخواہ کے نام سے جانا جاتا ہے، کے باجوڑ علاقے میں سڑک کے کنارے ہوئے بم دھماکے میں ہلاک ہونے والے پانچ افراد میں سےایک تھے۔

دی نیوز کے پشاور کے رپورٹر بہروز خان نے اخباری رپورٹوں کی تصدیق کی کہ مقتول جرگہ، یا قبائلی کونسل کی کوریج کر کے واپس آ رہا تھا۔ فروری میں کار بم دھماکہ کرنے والے کے مکان کی انہدامی کی کارروائی کا گواہ بنانے کے لیے اسے بلایا گیا تھا۔ اس دھماکے میں ایک مقامی معالج کی بھی موت ہو گئی تھی۔ یہ انہدامی کارروائی قبائلی کونسل کیس کا حصہ تھی۔

اخباری رپورٹوں کے مطابق، خان ایک مقامی اہلکار اور ایک قبائلی سربراہ کے ساتھ سفر کر رہے تھے، جنہوں نے اس کیس میں ایک ذمہ داری لے رکھی تھی۔ رپورٹوں میں بتایا گیا کہ ان کی گاڑی اس علاقے سے واپس آنے والے کارروان میں تیسرے نمبر پر تھی، اس سے امکان ہوتا ہے کہ اس گاڑی کو نشانہ بنایا گیا تھا۔

جاوید خان، مرکز اور ڈی ایم ڈیجیٹل ٹی وی
3 جولائی، 2007، اسلام آباد

میڈیا رپورٹوں کے مطابق، اسلام آباد میں واقع روزنامہ مرکز کے فوٹو گرافر اور برطانیہ میں واقع ڈی ایم ڈیجیٹل ٹی وی کے کیمرا مین خان کے سینے اور گردن میں اس وقت گولی ماری گئی جب وہ اسلام آباد میں سرکاری فورسز اور لال مسجد کے طلباء کے بیچ دو طرفہ فائرنگ کی زد میں آگئے تھے۔ اس تصادم میں چار دیگر صحافیوں کو بھی چوٹیں آئی تھیں۔

اخباری رپورٹوں میں کہا گیا تھا کہ اس جھگڑے میں دونوں طرف سے گولی باری ہوئی۔ اس مہلک گولی باری کا ماخذ فوری طور پر واضح نہیں تھا۔ پاکستانی سیکیورٹی فورسز نے مہینوں سے چل رہے جھگڑے کو ختم کرنے کی کوشش کے تحت مسجد کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ یہ مسجد جس کو طالبان نواز کی حیثیت سے جانا جاتا تھا، لیڈروں کی نظروں میں ناپسندیدہ سرگرمی جیسے مساج پارلر اور میوزک کیسٹ کی دکانوں کو ہٹانے کی کوششوں کا مرکز تھی۔

محمد عارف، اے آر وائی ون ورلڈ ٹی وی
19 اکتوبر 2007، کراچی

عارف اس بمباری میں ہلاک ہونے والے 130 سے زائد افراد میں شامل تھے جو سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کی گھر واپسی کا جشن منانے کے لیے منعقدہ ایک ریلی میں ہوئی تھی۔ ایک اسائنمنٹ انجام دینے کے لیے وہاں گئے کیمرامین اپنے پسماندگان میں اپنی بیوی اور چھ بچوں کو چھوڑ گئے۔ دو ماہ بعد راولپنڈی میں ایک ریلی میں بھٹو کی موت ہوئی۔

زبیر احمد مجاہد، جنگ
23 نومبر 2007، میرپور خاص

مقامی اخباری رپورٹوں کے مطابق، اردو زبان کے قومی روزنامہ، جنگ کے نامہ نگار، مجاہد کو اس وقت گولی مار دی گئی جب وہ شمالی صوبہ سندھ میں ایک دوسرے صحافی کے ساتھ موٹرسائیکل سے جا رہے تھے۔ انہیں نامعلوم بندوق برداروں نے نشانہ بنایا تھا، جو خود بھی موٹرسائیکل پر سوار تھے۔

مقامی میڈیا گروپ پاکستان پریس فاؤنڈیشن کے سکریٹری جنرل، اویس اسلم علی کےمطابق، مقامی صحافیوں کا ماننا تھا کہ مجاہد کی تفتیشی رپورٹنگ کی وجہ سے ان پر حملہ کیا گیا تھا۔ مجاہد جنگ کے اپنے ہفتہ وار کالم "جرم و سزا" میں مقامی جاگیرداروں اورپولیس کے ذریعے غریبوں کے ساتھ غلط برتاؤ سمیت مختلف مسائل پر اپنی تنقیدی تحریر کے لیےجانے جاتے تھے۔ علی نے CPJ کو بتایا کہ پولیس کی مبینہ بہیمیت پر ان کی کوریج پولیس اہلکاروں کی گرفتاری اور معطلی کا سبب بنی تھی۔ مجاہد اپنے پسماندگان میں بیوی اور چار بیٹوں کو چھوڑ گئے۔ کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔

چشتی مجاہد، *اخبار جہاں*
9 فروری 2008، کوئٹہ

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور مقامی اخباری رپورٹوں کے مطابق، نامعلوم حملہ آور نے ایک کالم نگار اورفوٹوگرافر مجاہد کے سر اور سینے میں اس وقت گولیاں ماریں جب وہ گھر سے نکل رہے تھے۔

مقامی اخباری رپورٹوں کا کہنا ہے کہ ممنوعہ سورش پسند گروپ، بلوچ لبریشن آرمی کے ترجمان نے کوئٹہ پریس کلب میں فون کر کے اس قتل کی ذمہ داری قبول کی تھی، ترجمان کا کہنا تھا کہ مجاہد بلوچ کاز کا "مخالف" تھا۔

جرنلسٹس یونین کے مطابق، نسلاً پنجابی، مجاہد کو 2007 میں بلوچ رہنما بلاچ مری کے قتل کے بارے میں لکھنے کے بعد ٹیلیفون پر متعدد دھمکیاں موصول ہوئی تھیں۔ جنگ میڈیا گروپ کے ذریعے شائع ہونے والا *اخبار جہاں* ملک کے اردو زبان کے سب سے بڑے ہفتہ وار رسائل میں سے ایک تھا۔

سراج الدین، *دی نیشن*
29 فروری 2008، منگورہ

پاکستانی اخباری رپورٹوں کے مطابق، سراج الدین کی موت اس خود کش بمباری میں ہوئی جس میں 40 سے زائد افراد کی جان چلی گئی تھی۔ کسی بھی تنظیم نے اس حملے کی ذمہ داری قبول نہیں کی، یہ حملہ مقتول پولیس آفیسر کے جنازے پر پیش آیا تھا اور جس میں دیگر دو صحافیوں سمیت، قریب 80 افراد زخمی ہوئے تھے۔

وادی سوات اس وقت تصادم کا مرکز تھی۔ جنگجوؤں نے 2007 میں اس علاقے کے بیشتر حصے پر قبضہ کرلیا تھا۔ سرکاری فورسز نے 2008 کے اوائل تک حالات پر کچھ قابو پا لیا تھا ۔

محمد ابراہیم، ایکسپریس ٹی وی اور *ڈیلی ایکسپریس*
22 مئی، 2008، کھار

اخباری رپورٹوں کے مطابق، ایکسپریس ٹی وی کے ایک رپورٹر ابراہیم کو باجوڑ قبائلی علاقے کے اصل شہر کھار سے باہر نامعلوم لوگوں نے گولی مار کر قتل کر دیا تھا۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور پشاور کی قریبی علاقائی راجدھانی میں واقع *واشنگٹن پوسٹ* کے نامہ نگار امتیاز علی کے مطابق، یہ صحافی طالبان کے مقامی ترجمان مولوی عمر کا انٹرویو لے کر موٹرسائکل سے واپس آ رہا تھا۔

علی نے مقامی صحافیوں سے ملنے والی معلومات کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ حملہ آوروں نے طالبان کے ترجمان کے ساتھ ابراہیم کے انٹرویو کا فوٹیج بھی لے لیا تھا۔ علی نے بتایا کہ ابراہیم نے اردو زبان کے اخبار *ڈیلی ایکسپریس* کے لیے بھی کام کیا تھا۔ اس معاملے میں نہ کوئی گرفتاری عمل میں آئی نہ ہی کسی نے اس کی ذمہ داری قبول کی۔

عبد العزیز شاہین، *آزادی*
29 اگست، 2008، سوات

طالبان کے ترجمان کے حوالے سے مقامی اخباری رپورٹوں کے مطابق، ایک پاکستانی ہوائی حملے کا نشانہ وہ لاک اپ بنا جہاں مقامی طالبان گروپ نے شاہین کو سوات گھاٹی میں قید کر رکھا تھا۔ *ڈیلی ٹائمز* اخبار کے مطابق، ترجمان مسلم خان نے بتایا کہ شاہین اس حملے میں ہلاک ہونے والے کم از کم 25 لوگوں میں شامل تھے۔ رپورٹ میں طالبان کی کمین گاہ کے علاقے کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی نہیں کی گئی۔

مقامی اخباری رپورٹوں کے مطابق، جنگجوؤں نے شاہین کو 27 اگست 2008 کو اغوا کرلیا تھا، جو اردو زبان کے مقامی روزنامہ *آزادی* کے لیے کام کرتے تھے اور کبھی کبھی دیگر اخبارات کے لیے بھی رپورٹیں تحریر کرتے تھے۔ پاکستان پریس فاؤنڈیشن کے سکریٹری جنرل اویس اسلم علی نے CPJ کو بتایا کہ مقامی صحافیوں کو یقین تھا کہ طالبان نے ان کے کام کی وجہ سے ان کو اغوا کیا ہے۔

گروپ کی رپورٹ کے مطابق، شاہین کو اغوا کیے جانے سے ایک ہفتے قبل ان کی کار کو آگ لگا دی گئی تھی، حالانکہ یہ بات واضح نہیں تھی کہ آیا اس حملے کے ذمہ دار طالبان ہی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس صحافی کو سوات کے مٹا تحصیل سب ڈویزن کے پیوچر علاقے سے اغوا کیا گیا تھا۔

عبد الرزاق جوہرا، رائل ٹی وی
3 نومبر 2008، پنجاب

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے مطابق چھ مسلح افراد نے جوہرا کو پنجاب کے میانوالی ضلع میں ان کو گھر سے گھسیٹ کر زبردستی باہر نکالا اور پھر انہیں گولی مار دی۔ یہ حملہ مقامی منشیات کی کالا بازاری پر ان کی رپورٹ نشر ہونے کے ایک دن بعد کیا گیا تھا۔

رفقائے کار کا کہنا تھا کہ 45 سال کے جوہرا، جنہوں نے ازیں قبل منشیات کی تجارت سے متعلق رپورٹیں تیار کی تھیں، انہیں دھمکیاں ملی تھیں جن میں کہا گیا تھا کہ وہ اس مسئلے کو کور کرنا چھوڑ دیں۔ مقامی صحافیوں کے مطابق پولیس نے قتل کی چھان بین کرنے کے لیے کوئی واضح اقدامات نہیں کیے۔

محمد عمران، ایکسپریس ٹی وی
طاہر اعوان، فری لانس
4 جنوری 2009، ڈیرہ اسماعیل خان

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور مقامی میڈیا کی اخباری رپورٹوں کے مطابق، ایک خودکش بمبار نے شمالی مغربی سرحدی صوبے میں، جس کو اب خیبر پختونخواہ کے نام سے جانا جاتا ہے، ایکسپریس ٹی وی کے زیر تربیت کیمرامین عمران کو، اور مقامی *اعتدال* اور *اپنا اخبار* نامی اخبارات کے فری لانس رپورٹر طاہر اعوان کو ہلاک کردیا۔

رپورٹوں میں کہا گیا تھا کہ یہ مہلک دھماکہ ایک چھوٹے سے دھماکے کے جواب میں کیا گیا اور یہ بظاہر جائے وقوعہ پر ابتدائی ردعمل ظاہر کرنے والوں کو نشانہ بنانے کے لیے کیا گیا تھا۔اخباری رپورٹوں کے مطابق، سر شام ہونے والے اس حملے میں کم از کم پانچ دیگر افراد ہلاک اور مزید متعدد لوگ زخمی ہوئے تھے، جس میں پولیس اور شہری بھی شامل تھے۔

موسا خان خیل، جیو ٹی وی اور *دی نیوز*
18 فروری 2009، سوات

مقامی اور بین الاقوامی رپورٹوں کے مطابق، حکومت اور مقامی جنگجو گروپوں کے مابین دو دن پہلے ہی ہونے والی جنگ بندی کی پہلی خلاف ورزی میں وفات پانے والے خان خیل کو ہلاک کرنے کی ذمہ داری کسی نے بھی قبول نہیں کی۔ رپورٹوں میں بتایا گیاکہ خان خیل کو اس وقت نشانہ بنایا گیا تھا جب وہ مقامی طالبان رہنما مولانا فضل اللہ کے خسر، ایک مسلم عالم صوفی محمد کی سربراہی میں ہونے والے امن مارچ کی کوریج کر رہے تھے۔ محمد نے حکومت کے ساتھ جنگ بندی کے جس معاہدے پر گفت و شنید کی تھی اس میں شمولیت کیلئے اپنے داماد کو بحال کروانا چاہتے تھے۔

جیو کے منیجنگ ڈائرکٹر اظہر عباس نے CPJ کوبتایا کہ خان خیل مٹا شہر کے قریب جنگجوؤں کے زیر اختیار علاقے میں رپورٹنگ کرنے والی چار نفری ٹیم کے باقی لوگوں سے جدا ہو گئے تھے۔ عباس نے بتایا کہ انہیں سینے اور سر کے پچھلے حصےمیں بندوق کی گولیوں کے متعدد زخم آئے تھے۔ خان خیل کے بھائی کا حوالہ دیتے ہوئے بی بی سی کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ اس صحافی کو بندوق کی زد پر رکھ کر امن مارچ سے اغوا کیا گیا تھا اور جس وقت ان کی لاش دریافت ہوئی تھی اس وقت ان کےہاتھ اور پیر بندھے ہوئے تھے۔

خان خیل نے ازیں قبل سپروائزروں کو بتایا تھا کہ سوات میں 2009 کے فوجی جارحیت کی اشتعال انگیز کوریج کے سبب فوج ان کے خلاف انتقامی کارروائی کر رہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں دھمکیاں دی جا رہی تھیں، رسائی سے منع کردیا گیا، اورپریس کانفرنسوں میں جانے سے ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس وقت کے ان کے سپروائزر حامد میر نے CPJ کو بتایا کہ خان خیل نے قتل والے دن انہیں

فون کر کے بتایا تھا کہ انہیں اپنی زندگی کا خوف لاحق ہوگیا ہے اور انہیں یقین ہے کہ انٹرسروسز انٹلیجنس ڈائرکٹوریٹ انہیں جان سے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ میر نے بتایا کہ اس کے چند گھنٹوں بعد ہی خان خیل کو ہلاک کردیا گیا تھا۔

جان اللہ ہاشم زادہ، فری لانس
24 اگست 2009، جمرود

مقامی اور بین الاقوامی اخباری رپورٹوں کے مطابق، چار نامعلوم بندوق برداروں نے افغان صحافی اور ان کے رفیق کار علی خان پر اس وقت گولیاں برسائیں جب وہ جمرود شہر ، خیبر ایجنسی، شمال مغربی پاکستان کے قریب ایک پبلک منی بس پر سفر کر رہے تھے۔

ایسوسی ایٹڈ پریس کے مطابق، ایک سفید سیڈان نے جس پر بندوق بردار سوار تھے، افغان سرحدی شہر ترخان سے پشاور کو جانے والی اس منی بس کا راستہ روکا جس پر ہاشم زادہ اور خان سوار تھے۔ اے پی کے مطابق، بندوق برداروں نے صحافیوں کو نشانہ بنایا جس میں ہاشم زادہ ہلاک ہو گئے اور خان بری طرح سے زخمی ہوئے۔ کسی اور کے زخمی ہونے کی اطلاع نہیں ملی تھی۔ بندوق برداروں نے جس قسم کی گاڑی استعمال کی تھی وہ پاکستان کی انٹلیجنس ایجنسی کے لیے ایک معیاری مسئلہ ہے۔

دونوں صحافی افغانستان کے شمشاد ٹی وی کے لیے کام کرتےتھے۔ خبروں میں بتایا گیا کہ اس اسٹیشن کے پشاور میں واقع بیورو چیف برائے پاکستان ہاشم زادہ اے پی، پجھوک افغان نیوز ایجنسی، اور دیگر اخباری اداروں کے لیے بھی رپورٹیں تحریر کرتے تھے۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق کسی نے بھی اس حملے کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔

رپورٹوں میں بتایا گیا کہ ہاشم زادہ افغانستان میں طالبان کی سورش پر تنقید کرنے کے لیے جانے جاتے تھے، اور ان کی رپورٹوں میں افغانستان و پاکستان دونوں ملکوں کے حکام اور انٹلیجنس ایجنسیوں کو چیلنج کیا گیا تھا۔ دانش کروخیل، ڈائرکٹر آف پجھوک افغان نیوز ایجنسی نے CPJ کو بتایا "انہیں چار ہفتے پہلے پشاور چھوڑنے اور پاکستان میں طالبان و القاعدہ کی سرگرمی کی رپورٹنگ نہ کرنے کی دھمکیاں ملی تھیں۔ یہ تو ظاہر ہے ... انہوں نے رپورٹنگ کے لیے اپنی جان گنوائی۔"

ایک مقامی صحافی داؤد خٹک نے، جو بعد میں ریڈیو فری یوروپ / پراگوئے میں ریڈیو لبرٹی میں شامل ہوگئے، کہا کہ ہاشم زادہ نے حال ہی میں پشاور کے حیات آباد علاقے میں ایک طالبان ترجمان کا انٹرویو لیا تھا۔ وہ اسٹوری فوج کو شرمندہ کر سکتی تھی کیونکہ یہ رپورٹ دکھاتی تھی کہ ایک نامور طالبان خاص شہر میں کھلم کھلا رہ رہا ہے۔

ملک عارف، سماء ٹی وی
16 اپریل 2010، کوئٹہ

اخباری رپورٹوں میں بتایا گیا تھا کہ کیمرا مین عارف کی ہلاکت ایک ہسپتال میں ہونے والی خودکش بمباری میں پیش آئی۔ یہ دھماکہ بدامنی کے شکار بلوچستان صوبے کی راجدھانی کوئٹہ میں سول ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کے باہر ہوا تھا، جس میں کم از کم آٹھ افراد ہلاک اور دیگر متعدد زخمی ہوگئے تھے، ان میں پانچ صحافی بھی شامل تھے۔ یہ صحافی ہسپتال کے باہر شیعوں کے ایک مظاہرے کو کور کر رہے تھے، جہاں ایک مشہور مقامی شیعہ بینک منیجر پر ہوئے حملے کے بعد انہیں لے جایا گیا تھا۔

عظمت علی بنگش، سماء ٹی وی
17 اپریل 2010، اورک زئی

افغانستان سرحد کے قریب وفاقی طور پر زیر انتظام قبائلی علاقوں میں اورک زئی کے قریب ریفیوجی کیمپ میں خوراک کی تقسیم کی کوریج کے وقت ہونے والی خودکش بمباری میں 34 سالہ کیمرا مین اور نامہ نگار، بنگش ہلاک ہو گئے تھے۔ وہ دو دنوں کے اندر خودکش بمباری میں ہلاک ہونے والے سماء کے دوسرے صحافی تھے۔

اخباری رپورٹوں کے مطابق، شمال مغربی پاکستان میں لڑائی جھگڑوں سے تنگ کوئی 47 ریفیوجیوں کی اس وقت موت واقع ہوگئی تھی جب ایک منٹ کے وقفے سے دو خودکش بم دھماکے ہوئے تھے اور جس میں ڈسٹری بیوشن لائن پر حملہ کیا گیا تھا۔ BBC اور CNN نے بتایا کہ سنی گروپ لشکر جھنگوی نے ان دھماکوں کی ذمہ داری قبول کی، جس میں شیعہ ریفیوجیوں کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہ بم دھماکہ 14 اپریل اور 17 اپریل 2010 کے درمیان شمال مغربی پاکستان میں ہونے والے پانچ بم دھماکوں میں سے ایک تھا۔

بنگش کی وفات قریبی فیلڈ ہسپتال میں ہوئی، اور انہوں نے پسماندگان میں بیوی اور تین بچوں کو چھوڑا۔

غلام رسول برہمنی، *ڈیلی سندھو حیدرآباد*
9 یا 10 مئی 2010، واہی پنڈھی

ڈیلی سندھو حیدرآباد کے رپورٹر،40 سال کے برہمنی ، کی لاش انہیں اغوا کیے جانے کی خبر کے ایک دن کے بعد یعنی، 10 مئی کو واہی پنڈھی، صوبۂ سندھ کے ان کے آبائی شہر کے باہر ملی تھی۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور میڈیا کے معاون گروپ پاکستان پریس فاؤنڈیشن کی رپورٹ کے مطابق ان کا جسم بری طرح سے داغدار تھا اور ظاہر کرتا تھا کہ ان کو اذیت دی گئی ہے۔

جرنلسٹس یونین نے بتایا کہ برہمنی کے اہل خانہ کا ماننا تھا کہ صوبۂ سندھ میں نسلی مسائل پر رپورٹنگ کرنے کی وجہ سے انھیں ہلاک کیا گیا تھا۔ ایک رفیق کار نے *ڈان* اخبار کو بتایا کہ ایک 12 سالہ لڑکی کی ایک 22 سالہ لڑکے سے شادی کے بارے میں ان کی اسٹوری اس حملے کی خاص محرک ہو سکتی ہے۔ پریس فاؤنڈیشن نے بتایا کہ برہمنی کے اٹھائے جانے سے قبل کے دنوں میں انہیں لاشاری کے ممبروں کی جانب سے دھمکیاں ملی تھیں۔

ان کی ہلاکت پر سیکڑوں صحافی احتجاج کرنے کے لیے ایک مارچ کرنے نکل پڑے۔ *ڈان* نے کچھ مظاہرین کے حوالے سے لکھا کہ اس معاملے کی سیاسی نزاکت کی وجہ سے پولیس اس کی چھان بین کرنے میں حارج تھی۔ جرنلسٹس یونین نے بتایا کہ برہمنی نے سندھی زبان کے متعدد روزناموں میں کئی برس تک کام کیا تھا۔ انھوں نے پسماندگان میں بیوی، دو بیٹے، اور ایک بیٹی چھوڑی ہے۔

اعجاز الحق، سٹی 42 ٹی وی
28 مئی، 2010، لاہور

اخباری بیانات اور CPJ کے انٹرویوز کے مطابق، مقامی لاہور کیبل اسٹیشن سٹی 42 ٹی وی کے 42 سالہ ٹکنیشین حق کو مسلم اقلیت کی احمدی مسجد پر مسلح حملہ کے جائے وقوعہ پر کام کے دوران ہلاک کردیا گیا تھا۔

حق جائے وقوعہ سے جو ان کے پڑوس میں ہی تھا سیل فون کی معرفت لائیو رپورٹنگ کر رہے تھے۔ سٹی 42 ٹی وی کے رفقائے کار نے بتایا کہ انہیں جو گولیاں لگی تھیں ان کی آواز ہوا میں بھی سنی جاسکتی تھی۔ یہ واضح نہیں تھا کہ اس جھگڑے کے دوران مہلک گولیاں کس نے چلائی تھیں، جس میں سنی مسلمان بندوق برداروں اور خود کش بمباروں نے مسجد پر حملہ کردیا تھا جبکہ پولیس اور فوجی گروپ ان کے ساتھ جنگ بندی میں شامل تھے۔

پاکستانی میڈیا رپورٹوں کا کہنا ہے کہ حق نے اپنے پسماندگان میں بیوی، ایک بیٹی اور ایک بیٹے کو چھوڑا ہے۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے مطابق، آٹھ سالہ تجربےکےحامل، وہ پچھلے تین سالوں سے سٹی 42 کے لیے کام کر رہے تھے۔

یہ مسجد اس دن حملے کی زد میں آنے والی دو احمدی مسجدوں میں سے ایک تھی۔ کئی گھنٹوں تک چلنے والے اس محاصرے میں 90 سے زیادہ افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ پاکستان کے بہت سے نیوز چینلوں نے اس واقعے کی لائیو رپورٹنگ کی تھی۔

اعجاز رائے ثانی، سماء ٹی وی
6 ستمبر، 2010، کوئٹہ

مقامی اور بین الاقومی اخباری رپورٹوں کے مطابق، کیمرامین رائے ثانی کی موت ایک فوجی ہسپتال میں اس گولی باری میں لگنے والے زخموں کے سبب ہوئی جس کا شکار وہ تین دن پہلے کوئٹہ میں تشدد کی شکل اختیار کر جانے والی ایک ریلی کی کوریج کے وقت ہوئے تھے۔

اخباری رپورٹوں میں بتایا گیا کہ ایک خودکش بمبار نے شیعوں کے ایک مظاہرے میں ڈیٹونیٹر سے دھماکے کیے تھے، جس سے گولی باری اور دیگر تشدد کی تحریک ملی اور اس میں 70 سے زیادہ افراد ہلاک اور کوئی 200 افراد زخمی ہوگئے تھے، جس میں متعدد دیگر صحافی بھی شامل تھے۔ مقامی اخباری رپورٹوں نے بتایا کہ طالبان اور لشکر جھنگوی دونوں نے ہی اس بمباری کی ذمہ داری قبول کی، جو شیعہ اجتماعات پر ہونے والے حالیہ دھماکوں کا ایک سلسلہ تھی۔ کچھ اخباری رپورٹوں نے اس تشدد کا سلسلہ بعد ازاں باقیماندہ مظاہرین پر ہونے والے کوئٹہ بم دھماکے سے بھی جوڑا۔

آج ٹی وی کے لیے کام کرنے والے ایک ڈرائیور محمد سرور بھی اس حملے میں ہلاک ہوگئے تھے۔ زخمی ہونے والوں میں چھ صحافی شامل تھے۔ رائے ثانی شادی شدہ تھے اور ان کے دو بچے ہیں۔

ایکسپریس ٹریبیون کی رپورٹ کے مطابق، پولیس نے 20 مشتبہ افراد کو حراست میں لیا اور بلوچستان کے چیف منسٹر نواب اسلم رائے ثانی نے حملے کی چھان بین کرنے کے لیے ایک عدالتی ٹریبیونل کی تشکیل کی۔ سماء ٹی وی کے نیوز ڈائرکٹر، زاہد حسین کے مطابق، فروری 2013 تک کسی بھی مشتبہ فرد کو مجرم قرار نہیں دیا گیا تھا۔

مصری خان، *اوصاف* اور *مشرق*

14 ستمبر 2010، ہنگو

اخباری رپورٹوں اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے مطابق، اخبار کے ایک رپورٹر اور مقامی جرنلسٹس ایسوسی ایشن کے صدر، خان کو اس وقت کئی گولیاں ماری گئیں جب وہ افغانستان کی سرحد کے قریب ہنگو میں پریس کلب کی عمارت میں داخل ہو رہے تھے۔ اردو زبان کے روزنامہ *اوصاف* کے نیوز ایڈیٹر ، شاہد صابر نے بتایا کہ دو یا اس سے زیادہ حملہ آور واضح طورپر ان کے انتظار میں گھات لگائے ہوئے تھے۔

خان خیبر پختونخواہ صوبے کی صوبائی راجدھانی، پشاور سے شائع ہونے والے اردو زبان کے روزنامہ اخبار *اوصاف*، اور *مشرق* کے رپورٹر تھے۔ خان ہنگو یونین آف جرنلسٹس کے صدر بھی تھے۔

انگریزی زبان کے روزنامہ *ڈان* نے رپورٹ دی کہ خان کو جنگجو تنظیموں سے دھمکیاں ملی تھیں۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے مطابق، خان 20 سال سے زیادہ عرصے سے صحافت کے پیشے سے وابستہ تھے، انھوں نے اپنی پیشے ورانہ زندگی کے دوران متعدد اخبارات کے لیے رپورٹنگ کی تھی۔ انہوں نے اپنے پسماندگان میں بیوی، چھ بیٹے اور پانچ بیٹیاں چھوڑیں۔

عبد الوہاب، ایکسپریس نیوز
پرویز خان، وقت ٹی وی
6 دسمبر 2010، غلانائی

بین الاقوامی اخباری رپورٹوں کے مطابق، وہاب اور خان مہمند قبائلی ضلع میں دوبرے خودکش بم حملے میں ہلاک ہونے والے 50 افراد میں شامل تھے۔

یہ صحافی علاقے کے انتظامی مرکز غلانائی میں قبائلی سربراہوں اور حکومت کے اہلکاروں کے مابین ایک میٹنگ کی کوریج کر رہے تھے کہ پولیس کی وردی پہنے دو خودکش بمباروں نے ڈیٹونیٹر سے دھماکے کر دیے۔ اخباری رپورٹوں کا کہنا تھا کہ یہ میٹنگ طالبان مخالف ایک جنگجو دستے کی تشکیل پر گفتگو کرنے کے لیے طلب کی گئی تھی۔ ایجنسی فرانس-پریس نے کہا کہ پاکستانی طالبان گروپ نے اس حملےکی ذمہ داری لی، جس میں 100 سے زیادہ افراد زخمی ہو گئے۔

یہ دونوں صحافی کیمرامین اور رپورٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔

ولی خان بابر، جیو ٹی وی
13 جنوری 2011، کراچی

28 سالہ بابر کو ملک کے سب سے وسیع پیمانے پر دیکھے جانے والے نشریہ جیو ٹی وی پر گروہی تشدد کے تعلق سے ان کی اسٹوری نشر ہونے کے فوراً بعد گولی مار دی گئی تھی۔ جیو ٹی وی کے منیجنگ ڈائرکٹر اظہر عباس نے CPJ کو بتایا کہ کم از کم دو حملہ آوروں نے کراچی کے لیاقت آباد علاقے میں رات کے 9:20 بجے اس صحافی کی گاڈی کو روک کر ان کے سر میں چار اور

گردن میں ایک گولی ماری۔ عباس نے کہا کہ گواہوں نے بتایاکہ گولیاں برسانے سے پہلے ایک حملہ آور نے بابر سے مختصر سی بات کی تھی۔

اپریل میں، پولیس نے پانچ لوگوں کی گرفتاری کا اعلان کیا اور کہا کہ اس میں بڑے پیمانےپر مزید مشتبہ افراد شامل ہیں۔ پولیس نے بتایاکہ کل ملا کر کم از کم 17 افراد قتل کے اس پلاٹ میں ملوث تھے۔ مشتبہ افراد کے ذریعے دیے گئے بیان کی بنیاد پر پولیس نے متحدہ قومی موومنٹ، یاMQM کے ذریعے ، جو پاکستان کی تیسری سب سے بڑی سیاسی جماعت ہے اور جس کو یہاں کی سب سے زیادہ بااثر سیکولر سیاسی تنظیم خیال کیا جاتا ہے، یہ پلاٹ تیار کیے جانے کی بات کہی۔ ایک جوائنٹ انوسٹی گیشن ٹیم کی رپورٹ میں کہا گیا کہ اس ہلاکت کا حکم جنوبی افریقہ میں مقیم MQM کے کارندے، آغا مرتضی نے دیا تھا۔ سندھ کے وزیر داخلہ، ذو الفقار مرزا نے اس وقت بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس ہلاکت کے لیے MQM کے کارندے ذمہ دار ہیں۔

مقامی صحافیوں کا ماننا ہے کہ سیاسی برتری کی جنگ، اغوا برائے تاوان، ابدافی قتل، بجلی کی چوری اور اراضی پر ناجائز قبضے سے متعلق بابر کی اشتعال انگیز رپورٹنگ سے اس ہلاکت کو تحریک ملی۔

بابر کے قتل کیے جانے کے بعد والے ہفتوں میں تفتیش سے تعلق رکھنے والے متعدد افراد کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ ان میں پولیس کا ایک مخبر، دو پولیس کانسٹبل، اور ایک تفتیشی افسر کے بھائی بھی شامل تھے۔ ان میں سے ایک کانسٹبل، آصف رفیق اس وقت جائے وقوعہ پر موجود تھا جب بابر کو قتل کیا گیا تھا اور اس نے یہ پلاٹ تیار کرنے والوں کی گاڑی کی شناخت کی تھی۔ 10 نومبر 2012 کو موٹرسائیکل پر سوار دو بندوق برداروں نے حیدر علی کو، جو اس مقدمے کا بچ جانے والا واحد گواہ تھا، کراچی کے سولجر بازار علاقے میں اس کے گھر کے قریب مار ڈالا۔ وہ دو دن بعد عدالت میں گواہی دینے کے لیے جانے والا تھا۔

اس مقدمے کے اصل پروسیکیوٹر— محمد خان بریرو اور مبشر مرزا — نے CPJ کو بتایا کہ انہیں دھمکی دی گئی اور پھر ان کو کام سے نکال دیا گیا ۔ وہ 2011 کے اواخر میں ملک سے کوچ کر گئے۔

نصر اللہ خان آفریدی، پاکستان ٹیلی ویژن اور مشرق
10 مئی 2011، پشاور

مقامی اور بین الاقوامی اخباری رپورٹوں کے مطابق، پاکستان ٹیلی ویژن اور مقامی اخبار مشرق کے رپورٹر آفریدی اس وقت ہلاک ہو گئے تھے جب ان کی کار پشاور شہر میں بم سے اڑائی گئی ۔ اخباری رپورٹوں میں بتایا گیا کہ گاڑی میں آفریدی کے آتے ہی گاڑی کو جو گھنی آبادی والے بازار میں کھڑی تھی، ریموٹ کے ذریعے دھماکہ کر کے اڑایا گیا تھا۔

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے بتایا کہ آفریدی جو ٹرائبل یونین آف جرنلسٹس کے صدر بھی تھے، جنگجو گروپوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے پشاور منتقل ہو گئے تھے۔

مئی 2006 میں، CPJ نے بتایا ہ کے وفاق طور پر زیر انتظام قبائلی علاقے میں خیبر ایجنسی کے اصل شہر بارا میں نامعلوم حملہ آوروں نے آفریدی کے گھر پر دو ہینڈ گرینیڈ پھینکے تھے۔ آفریدی کو اسلامی جنگجو تنظیم لشکر اسلام کے ذریعے چلائے جانے والے ایک غیر قانونی ریڈیو اسٹیشن پر جاری کردہ موت کی دھمکی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہ دھمکی آفریدی کی اس رپورٹ کے بعد دی گئی تھی کہ حکام کو ایک حملے کے لیے جس میں ایک پیرا ملٹری سپاہی زخمی ہوگیا تھا، لشکر اسلام کے ذمہ دار ہونے کا شبہہ ہے۔

اس حملے کے بعد وہ صحافی اسلام آباد منتقل ہوگیا تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ وہاں کے اہلکاروں نے دھمکی دیے جانے کی اس کی شکایتوں پر توجہ نہیں دی گئی۔ اس کے بعد وہ پشاور کے ایک متمل علاقے حیات آباد میں منتقل ہو گئے تھے۔ لیکن 2007 کے وسط میں حیات آباد میں واقع ان کے گھر پر گرینیڈ پھینکے گئے۔ اس حملے میں کوئی زخمی نہیں ہوا تھا۔

افغان سرحد کے قریب خطرناک علاقوں میں آپس میں مربوط صحافی برادری میں آفریدی ایک مشہور، سینئر شخص تھے۔ رفقائے کار، سیاسی رہنماؤں، اور قبائلی بزرگوں سمیت، سیکڑوں افراد ان کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے۔ اس معاملے میں کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔

سلیم شہزاد، *ایشیا ٹائمز آن لائن*
29 یا 30 مئی 2011، منڈی بہاؤ الدین

40 سالہ شہزاد القاعدہ اور پاکستانی بحریہ کے بیچ مبینہ تعلقات کے بارے میں تحریر کرنے کے بعد 29 مئی کو لاپتا ہو گئے تھے۔ ان کی لاش راجدھانی اسلام آباد سے قریب 75 میل (120 کلو میٹر) دور ایک نہر میں قصبہ منڈی بہاؤ الدین کے قریب 31 مئی کو ملی تھی۔ ان کے دوستوں نے بتایا کہ لاش پر چہرے اور گردن کے آس پاس اذیت دینے کے نشانات نظر آرہے تھے۔ انہوں نے رفقائے کار کو بتایا تھا کہ انہیں حالیہ مہینوں میں انٹلیجنس کے اہلکاروں کی جانب سے دھمکیاں مل رہی تھیں۔

اسلام آباد میں ٹیلی ویژن پر پیش ہونے والے ایک پینل مباحثہ کے لیے حاضر نہ ہوپانے کے بعد ان کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی گئی تھی۔ وہ *ایشیا ٹائمز آن لائن* کے لیے اپنے حالیہ مضمون پر گفتگو کرنے والے تھے جس میں انہوں نے رپورٹ دی تھی کہ 22 مئی کو کراچی کے بحری بیس پر 17 گھنٹے تک چلنے والے آپریشن کے پس پشت پاکستانی بحریہ میں گھس پیٹھ بنا لینے والے القاعدہ کا ہاتھ تھا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ حملہ اس وقت کیا گیا جب فوج یا سیکیورٹی اہلکاروں نے جنگجو گروپوں سے تعلق رکھنے کے شبہے میں بحریہ کے اہلکاروں کے ایک گروپ کو رہا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ 2 مئی کو اسامہ بن لادن کو امریکہ کے ذریعے مار دیے جانے کے فوراً بعد ہونے والا یہ حملہ پاکستانی فوج کے لیے بڑا شرمناک تھا۔ مئی کے اوائل میں، کراچی میں، جو ایک بڑا ساحلی شہر ہے اور جہاں بحریہ کا صدر دفتر واقع ہے ریموٹ کنٹرول آلات کے ذریعے رنگروٹوں کو لے کر آنے والی بحریہ کی تین بسیں اڑا دی گئی تھیں۔

شہزاد کی موت بھی *ان سائڈ طالبان اینڈ القاعدہ* نامی ان کی کتاب کے منظر عام پر آنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد ہوئی تھی۔

مہینوں تک وہ صحافی دوستوں سے کہتے رہے تھے کہ انہیں انٹلیجنس ایجنٹوں کے ذریعے سیکیورٹی کے حساس معاملات پر رپورٹنگ بند کردینے کی تنبیہ کی جا رہی تھی ۔ اکتوبر 2010 میں، شہزاد نے پاکستان کے ہیومن رائٹس واچ کے محقق، علی دیان حسن کو بتایا تھا کہ راولپنڈی میں انٹرسروسز انٹلیجنس ڈائرکٹوریٹ کے صدر دفاتر میں ہونے والی ایک میٹنگ میں سرکردہ اہلکار کے ذریعے انہیں دھمکی دی گئی تھی۔

ہیومن رائٹس واچ کی رپورٹ کے مطابق، حسن نے بتایا کہ شہزاد نے انہیں اس میٹنگ کی وضاحت پر مشتمل ایک نوٹ بھیجا تھا کہ "شاید مستقبل میں میرے یا میرے اہل خانہ کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آجائے"۔ آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی کے صدر اور شہزاد کے سابق آجر، حمید ہارون نے بتایا کہ تقریباً اسی وقت انہیں بھی اسی طرح کا پیغام ملا تھا۔

جولائی 2011 میں،*دی نیو یارک ٹائمز* نے رپورٹ پیش کی تھی کہ امریکی اہلکاروں کے پاس معتبر انٹلیجنس تھی جس سے پتہ چلا کہ آئی ایس آئی ہی شہزاد کے قتل کے لیے ذمہ دار ہے۔ پاکستان کی سرکاری کمیشن انکوائری نے جنوری 2012 میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مرتکبین جرم نامعلوم تھے، اور یہ نتیجہ ایساتھا جس کی وسیع پیمانے پر تنقید کی گئی تھی کیونکہ اس میں معتبریت کا فقدان تھا۔

اسفند یار خان، *اخبار خیبر*
11 جون2011، پشاور
شفیع اللہ خان، *دی نیوز*
17 جون، 2011، واہ کنٹونمنٹ

اخبار خیبر نامی اخبار کے رپورٹر، اسفند یار خان کی موت ایک دوہرے بم دھماکے میں ہوئی تھی جس میں تین درجن سے زیادہ افراد کی جانیں چلی گئی تھیں۔ روزنامہ *دی نیوز* میں زیر تربیت رپورٹر شفیع اللہ خان، اس حملے میں بری طرح سے جل جانے اور بم کے ٹکڑوں سے ہونے والے زخموں کے سبب چھ دن کے بعد وفات پا گئے تھے۔ دیگر سات صحافی بھی زخمی ہو گئے تھے۔

اخباری رپورٹوں اور مقامی صحافیوں کے مطابق، پہلا چھوٹا دھماکہ ایک بازار میں ہوا تھا، جہاں اس اسٹوری کی کوریج کے لیے صحافیوں سمیت، لوگوں کی ایک بڑی بھیڑ اکٹھی ہوگئی تھی۔ دوسرا، قدرے بڑا دھماکہ جو بدیہی طور پر خود کش بم تھا، بھیڑ بڑھ جانے کے بعد ہوا۔

یہ حملہ سٹی سنٹر کے قریب ایک ایسے علاقے میں ہوا جو فوجی سہولیات کا مرکز ہے اور جہاں بڑی بڑی پاکستانی میڈیا تنظیموں کے دفاتر ہیں۔ فوری طور پر کسی بھی گروپ نے ان بم دھماکوں کی ذمہ داری قبول نہیں کی، اور یہ واضح نہیں تھا کہ آیا صحافیوں یا فوجی اہلکاروں کو نشانہ بنایا گیا تھا ۔

فیصل قریشی، *لندن پوسٹ*
7 اکتوبر 2011، لاہور

پاکستانی روزنامہ *دی ایکسپریس ٹریبیون* کی رپورٹ کے مطابق، سیاسی خبروں کی ویب سائٹ *دی لندن پوسٹ* کے 31 سالہ ایڈیٹر، قریشی کے اہل خانہ کو ان صحافی کے گھر کے باہر خون کے دھبے نظر آنے کے بعد ان کے بھائی، زاہد کو قریب 2 بجے رات کو ان کی لاش ملی تھی۔ *دی ایکسپریس ٹریبیون* نے بتایا کہ پولیس کی رپورٹوں میں بتایا گیا کہ قریشی کی لاش پر اذیت دینے کے نشانات نظر آ رہے تھے، نیز ان کا گلا کٹا ہوا تھا۔

دوسرے بھائی شاہد، جو لندن میں رہتے ہیں، انہوں نے CPJ کو بتایا کہ قاتل ان صحافی کا لیپ ٹاپ اور ٹیلیفون بھی لے گئے تھے۔ شاہد قریشی نے جو خود بھی *لندن پوسٹ* کی ویب سائٹ کے لیے لکھتے ہیں، CPJ کو بتایا کہ وہ اور ان کے بھائی کو ایسے لوگوں کی جانب سے موت کی دھمکیاں ملی تھیں جنہوں نے متحدہ قومی موومنٹ، یا MQM سے تعلق ہونے کا دعویٰ کیا تھا ۔ *دی لندن پوسٹ* نے، جو بڑے پیمانے پر MQM مخالف کے بطور جانا جاتا ہے، پارٹی کے جلا وطن قائد الطاف حسین کے اوپر سلسلہ وار تنقیدی اسٹوریز پیش کی تھیں۔

مقامی اخباری رپورٹوں کے مطابق، پولیس نے دسمبر 2011 میں قریشی کے بچپن کے دوست فیصل حمید کو گرفتار کیا اور مالی محرکات کی بات کہی تھی۔ فروری 2013 تک حمید تحویل زیر التواء سماعت میں رہے۔ سماء ٹی وی کے ذریعے پیش کردہ ایک تفتیشی ڈاکیومنٹری میں پولیس کی تفتیش کے بارے میں متعدد سوالات اٹھائے گئے تھے اور حمید کے مبینہ کردار پر شبہے کا اظہار کیا گیا۔

جاوید نصیر رند، *ڈیلی ٹاور*
نومبر 2011، خضدر

اخباری رپورٹوں کے مطابق رند کی لاش ان کے اغوا کیے جانے کے قریب دو مہینے کے بعد، 5 نومبر کو خضدر میں ملی تھی۔ مقامی اخباری میڈیا رپورٹوں کے مطابق، اس صحافی کے سر اورسینے میں متعدد گولیاں پیوست کی گئی تھیں اور ان کی لاش پر اذیت دینے کے متعدد نشانات بھی نظر آرہے تھے۔ یہ ہلاکت بظاہر ان کی لاش ملنے کے عین قبل ہوئی تھی۔

اردو زبان کے روزنامہ *ڈیلی ٹاور* کے ایڈیٹر اور کالم نگار، رند کو 11 ستمبر کو جنوبی بلوچستان صوبے میں ان کے آبائی گھر سے اغوا کیا گیا تھا۔ *ڈیلی ٹاور* متحارب گروپوں اور حکومت کے مابین بہت سارے جھگڑوں کے کوریج کے لیے جانا جاتا تھا۔ اخباری رپورٹوں میں بتایا گیا کہ رند بھی علاحدگی پسند بلوچ نیشنل موومنٹ کے ایک سرگرم کارکن تھے۔

بلوچستان یونین آف جرنلسٹس نے رند کے اغوا اور قتل کے واقعے کی مذمت کرتےہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس حملے کی جانچ پڑتال کے لیے ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی قائم کی جائے۔ کسی بھی گروپ نے اس ہلاکت کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔

مکرم خان عاطف، دیوا ریڈیو

17 **جنوری** *2012* **شب قدر میں**

امریکی حکومت کے مالی تعاون سے چلنے والے وائس آف امریکہ کی پشتو سروس کے نامہ نگار عاطف کو دو بندوق برداروں نے شمالی پشاور میں واقع شب قدر مسجد میں ہلاک کردیا۔ پولیس نے نامہ نگاروں کو بتایا کہ مغرب کی نماز کے دوران حملہ آوروں نے عاطف کو کئی گولیاں ماریں اور پھر موٹر سائیکلوں سے فرار ہوگئے۔ عاطف پشاور کے لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں اپنے زخموں کی تاب نہ لاکر چل بسے۔ اس حملے میں مسجد کے امام بھی زخمی ہوگئے تھے۔

طالبان کے ترجمان نے متعدد اخباری اداروں کو اس ہلاکت کی ذمہ داری لینے کے بار ے میں بتایا۔ احسان اللہ احسان نے ایسوشی ایٹیڈ پریس کو بتایا کہ عاطف کو کئی بار تنبیہ کی گئی تھی "کہ طالبان مخالف رپورٹنگ بند کردیں، لیکن انھوں نے رپورٹنگ بند نہیں کی۔ آخرکار وہ اپنے انجام کو پہنچے۔"

CPJ کے متعدد ذرائع نے بتایا کہ انہیں اس بات پر شبہہ ہے کہ عاطف کو طالبان کے حکم پر یا عوامی طور پر بیان کی جانے والی وجہ کے سبب ہلاک کیا گیا تھا۔ عاطف نے دوستوں اور رشتہ داروں کو بتایا تھا کہ افغانستان کی سرحد کے قریب سلالہ میں پاکستانی فوجی چیک پوسٹوں پر امریکہ کی زیر قیادت ناٹو افواج کے ذریعے نومبر 2011 کے حملے کی کورنگ کے فوراً بعد ہی اسے فوج اور

انٹلی جنس اہلکاروں کی جانب سے دھمکیاں ملنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس حملے میں چوبیس پاکستانی سپاہیوں کی موت ہوگئی تھی۔ عاطف نے اس حملے کے تعلق سے دیوا ریڈیو کیلئے رپورٹیں پیش کی تھیں اور دو رخی کہی جانے والی بات چیت میں حصہ لیا تھا، جس کا اسٹیشن کے اسٹوڈیو صحافیوں کے ساتھ رواں تبادلہ کیا جاتا ہے۔

قبائلی علاقے کے ایک صحافی نے CPJ کو بتایا کہ عاطف نے مقامی باشندوں سے بات کی تھی جن کا کہنا تھا کہ طالبان کی ایک کمین گاہ فوجی چیک پوسٹس سے محض دو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ فوجی چوکیوں سے طالبان کی قربت انتہائی حساس معلومات تھی کیونکہ شاید اسی نے امریکی حملے کیلئے جواز فراہم کیا تھا۔ امریکی قومی سلامتی کونسل کے ایک اہلکار نے CPJ کو بتایا کہ خصوصی افواج کی ٹیم نے پاکستانی چیک پوسٹس کے علاقے سے گولی باری ملنے کے بعد حملے کی شروعات کی تھی۔

دیوا ریڈیو نے بتایا کہ عاطف کی رپورٹوں نے اس علاقے کا جغرافیہ بیان کیا تھا لیکن اس میں طالبان کا ذکر نہیں تھا۔ دیوا نے اس بابت معلومات طلب کرنے سے متعلق CPJ کے بار بار استفسار کرنے پر بھی کوئی جواب نہیں دیا کہ عاطف کے ساتھ ان کے دو رخی تبادلوں کے دوران اسٹیشن کے اسٹوڈیو صحافیوں نے کیا کہا تھا۔ دیوا نے بتایا کہ عاطف کی رپورٹوں کا کوئی آرکائیو دستیاب نہیں ہے۔ پاکستان اور امدیکہ میں CPJ کے متعدد ذرائع نے بتایا کہ ایسا مانا جاتاہے کہ اس قتل کے پیچھے انٹر سروسز انٹلی جنس کے ڈائریکٹر کا ہاتھ ہے۔ ایک پاکستانی سیکیورٹی اہلکار نے کہا کہ یہ قیاس بے بنیاد ہے۔

رزاق گل، ایکسپریس نیوز ٹی وی
19 مئی 2012، تربت

اخباری رپورٹوں کے مطابق، بلوچستان کے کیچ ضلع کے ایک شہر، تربت میں ایکسپریس نیوز ٹی وی کے ایک 35 سالہ سینئر رپورٹر، گل کو 18 مئی کی شام کو ان کے گھر کے پاس سے اغوا کرلیا گیا تھا۔ ان کے اہل خانہ نے مقامی صحافیوں کو بتایا کہ ان کی لاش اگلے دن ملی تھی جس پر بلیٹ کے متعدد زخم اور ایسے نشانات تھے جو انہیں اذیت دیے جانے کا اشارہ دیتے تھے۔

اخباری رپورٹوں کے مطابق، گل ایک قومیت پرست سیاسی تنظیم بلوچ نیشنل موومنٹ کے ممبر، اورپریس کلب آف تربت کے سکریٹری تھے۔ کلب کے ان کے رفقائے کار نے ایکسپریس نیوز ٹی وی کو بتایا کہ گل نے کوئی دھمکی ملنے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کسی بھی گروپ نے ان کی موت کی ذمہ داری قبول نہیں کی ۔

عبد القادر حاجی زئی، واش ٹی وی
28 مئی2012، کوئٹہ

مقامی اخباری رپورٹوں کے مطابق مسلح افراد نے مڈل اسکول کے ایک ہیڈماسٹر کو جو بلوچی زبان کے ایک پرائیوٹ ٹی وی چینل، واش ٹی وی کے لیے بھی کام کرتے تھے، گولی مار دی۔ رپورٹوں میں بتایا گیا کہ صحافی کو ہسپتال لے جایا گیا جہاں ان کی موت ہو گئی۔

حاجی زئی کو شمسی ایئر فیلڈ کے مسکن، وشیک ضلع کے بسیما علاقے میں ہلاک کیا گیا تھا، جو پاکستان کے وفاق طور پر زیر انتظام قبائلی علاقوں میں جنگجوؤں کی نگرانی ڈرون آپریشنوں کے لیے امریکہ کے ذریعے ایک بیس کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

حاجی زئی کی موت کے دو دن بعد بلوچ لبریشن فرنٹ نامی ایک مسلح علاحدگی پسند گروپ نے انہیں سرکاری مخبر قرار دیتے ہوئے اس ہلاکت کی ذمہ داری قبول کی۔ صحافی کے رفقائے کار نے بتایا کہ ان کو حاجی زئی کے خلاف کسی قسم کی دھمکیوں کی جانکاری نہیں تھی۔

بلوچستان یونین آف جرنلسٹس نے اس ہلاکت کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بیان جاری کیا اور سپریم کورٹ و بلوچستان ہائی کورٹ سے صحافیوں کو ملنے والی دھمکیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پر قابو پانے کی اپیل کی۔

عبد الحق بلوچ، اے آر وائی ٹیلی ویژن
29 ستمبر 2012، خضدر

نامعلوم حملہ آوروں نے حق کو اس وقت گولی مار دی جب وہ صوبۂ بلوچستان کے خضدر شہر میں واقع خضدر پریس کلب سے نکل کر جا رہے تھے۔ حق پریس کلب کے سکریٹری جنرل اور ایک طویل عرصے سے اے آر وائی ٹیلی ویژن کے مقامی نامہ نگار تھے۔

اے آر وائی ٹیلی ویژن نے بتایا کہ اس کو حق کے تئیں کسی قسم کی دھمکی ملنے کی جانکاری نہیں تھی لیکن ایک مشہور پاکستان صحافی، حامد میر نے حق کی وفات کے بعد لکھا تھا کہ ان صحافی کو بلوچ مسلح دفاع آرمی (BMDA، یا The Armed Baluch Defense) کی جانب سے نومبر 2011 میں دھمکیاں ملی تھیں اور بالآخر BMDA کے ترجمان کے ذریعے جاری کردہ ہٹ لسٹ میں انہیں نامزد کیا گیا تھا۔

اکتوبر 2011 میں ممنوعہ گروپوں کے اخباری کوریج پر بلوچستان ہائی کورٹ کے پابندی لگانے کے بعد پریس کے ساتھ پیدا شدہ تناؤ بڑھ گیا تھا۔ کچھ ممنوعہ گروپوں نے اپنے جنگی آپریشن کی رپورٹنگ نہ کرنے پر مقامی صحافیوں کو دھمکیاں دینا شروع کردیا۔

حق کے اہل خانہ نے ان کے رفقائے کار کے ذریعے وسیع پیمانے کی ان یقین دہانیوں پر گفتگو کرنے سے انکار کر دیا کہ انہیں اس وجہ سے ہلاک کیا گیا کہ سیکیورٹی فورسیز اس بات سے نالاں تھیں کہ وہ پاکستان کے سپریم کورٹ کی کوئٹہ بینچ کے سامنے مقدمات کو پیش کرنے میں گمشدہ بلوچیوں کے خاندانوں کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ حق کی وفات کے وقت، عدالت میں بلوچستان میں 100 سے زیادہ گمشدہ افراد سے متعلق سماعت چل رہی تھی۔ ان مقدمات میں 19 کا تعلق خضدر سے تھا۔

مشتاق کھانڈ، دھرتی ٹیلی ویژن نیٹ ورک اور *مہران*
7 اکتوبر 2012، خیر پور

35 سالہ کھانڈ صوبہ سندھ کے خیر پور میں پاکستان پیپلز پارٹی کی ریلی پر بندوق برداروں کے ذریعے کی گئی فائرنگ میں ہلاک ہونے والے چھ افراد میں سے ایک تھے۔ 10 سالہ تجربے کے حامل صحافی، کھانڈ دھرتی ٹیلی ویژن نیٹ ورک کے رپورٹر تھے اور پانچ سال تک خیر پور پریس کلب کے صدر رہے تھے۔ انہوں نے حیدرآباد میں سندھی زبان کے ایک اخبار *مہران* کے لیے بھی کام کیا تھا۔

اخباری رپورٹوں میں بتایا گیا کہ اس گولی باری کے بعد پولیس نے رات بھر چھاپے مارے اور 10 نامعلوم مشتبہ افراد کو گرفتار کیا۔ اخباروں نے اس گولی باری کے مختلف محرکات کی رپورٹیں پیش کیں۔ تفتیش کاروں نے پہلے تو اس حملے کے لیے خاندانی تنازعہ کو مورد الزام قرار دیا؛ جیو ٹی وی نے یہ رپورٹ پیش کی کہ ریلی میں دو متحارب گروپوں کے مابین جھگڑے کے بعد گولی باری کا یہ معاملہ پیش آیا تھا۔

کھانڈ نے پسماندگان میں دو بیویاں اور کئی بچے چھوڑے۔ خیر پور کے قریب ان کے آبائی گاؤں میں ان کے جنازے کے بعد ان کے رفقائے کار اور دوستوں نے خیر پور پریس کلب کے سامنے مظاہرہ کیا، اور اپنے شہریوں کی حفاظت کرنے میں حکومت کی ناکامی کے خلاف احتجاج کیا۔

رحمت اللہ عابد، دنیا نیوز ٹی وی اور *انتخاب*
18 نومبر 2012، پنجگوڑ

کوئٹہ سے قریب 375 میل (600 کلو میٹر) دور ، پنجگوڑ ضلع میں موٹر سائیکل پر سوار نامعلوم بندوق برداروں نے نائی کی دکان پر عابد کو ہلاک کر دیا۔ عابد نے خبروں اور حالات حاضرہ سے متعلق اردو زبان کے ایک ٹی وی چینل دنیا نیوز کے لیے ایک جنرل اسائنمنٹ رپورٹر کی حیثیت سے کئی سال تک کام کیا تھا اور انہوں نے اردو زبان کے روزنامہ اخبار *انتخاب* کے لیے بھی کام کیا تھا۔

پاکستان پریس فاؤنڈیشن کے مطابق، عابد کو چھ گولیاں ماری گئی تھیں جس میں سے ایک ان کے سر پر لگی ۔ PPF نے یہ بھی رپورٹ دی کہ بلوچستان یونین آف جرنلسٹس کے صدر عیسی ترین نے بتایا کہ عابد کے اہل خانہ ان کی موت کا باعث بن سکنے والی کسی ذاتی دشمنی سے لاعلم تھے۔

اخباری رپورٹوں کے مطابق، بلوچستان کے چیف منسٹر اسلم رائے ثانی نے ایک بیان جاری کرتے ہوئے کہا کہ بلوچی صحافیوں کو کام کرنے سے روکنے کے لیے "خفیہ ہاتھ" ان کے اوپر حملے کر رہے ہیں۔ PPF میں عابد کے رفقائے کار نے بتایا کہ انہیں یقین ہے کہ عابد کی رپورٹنگ کی وجہ سے ہی انہیں ہلاک کیا گیا۔ بلوچستان یونین آف جرنلسٹس نے مقامی اور وفاقی حکومتوں سے پاکستانی صحافیوں کو دھمکیاں ملنے کے بڑھتے ہوئے معاملات کی طرف توجہ کرنے کی اپیل کی۔

ثاقب خان، *امت*
22 نومبر 2012، کراچی

انٹرنیشنل فیڈریشن آف جرنلسٹس اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے مطابق، اردو زبان کے اخبار *امت* کے فوٹوگرافر، خان، کی موت ایک بم دھماکے میں آنے والے زخموں کی وجہ سے ہو گئی، جو کراچی میں ایک شیعہ مقام کے باہر ہوئے ایک دھماکے کے 30 منٹ بعد ہوا تھا۔ انہیں ذرائع نے بتایا کہ خان پہلے ہونے والے دھماکے کی کوریج کرتے وقت ہلاک ہوگئے تھے۔

پولیس نے بتایا کہ پہلا دھماکہ ایک خودکش حملہ تھا، جبکہ دوسرا دھماکہ ریموٹ کنٹرول آلے سے ڈیٹونیٹر کے ذریعے کیا گیا تھا۔ دوسرا بم پہلے والے سے قریب 50 فٹ کی دوری پر پھٹا تھا، جس میں جائے وقوعہ پر پہنچنے والے رپورٹر، پولیس افسران، اور بم کو ناکام کرنے والی ٹیم کے افراد زخمی ہو گئے تھے۔

یہ بم شیعوں کی یادگاری تقریب کے لیے بکثرت استعمال ہونے والے مقام پر پھٹے تھے؛ شیعہ حضرات اسلامی کیلنڈر کے پہلے مہینے، محرم کے مقدس مہینے کی تقریب کا اہتمام کر رہے تھے۔

کسی بھی گروپ نے ان دونوں بم دھماکوں کی ذمہ داری قبول نہیں کی، لیکن دھماکوں کے دو دن بعد، طالبان کے ترجمان احسان اللہ احسان نے ایجنس فرانس پریس کو فون کیا اور بتایا کہ طالبان نے شیعہ مسلموں کو نشانہ بنانے کے لیے 20 سے زیادہ خودکش بمبار روانہ کر دیے ہیں۔

2003-2012 میں ہلاک ہونے والے صحافی: محرک کی تصدیق نہیں ہوئی

یہ ان صحافیوں سے متعلق کیپسول رپورٹیں ہیں جو غیر واضح حالات میں ہلاک ہوئے تھے۔ جہاں کوئی محرک غیر واضح ہو، لیکن اس کا امکان ہو کہ کسی صحافی کو اس کے کام کی وجہ سے ہلاک کیا گیا تھا، تو وہاں پر CPJ ان معاملات کی درجہ بندی "غیر تصدیق شدہ" کے بطور کرتی ہے اور تفتیش جاری رکھتی ہے۔ CPJ معاملات کی جاری تفتیش کے لحاظ سے مستقل ان کی درجہ بندی کرتی ہے۔

محمد اسماعیل
پاکستان پریس انٹرنیشنل
1 نومبر 2006، اسلام آباد

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے اس وقت کے سکریٹری جنرل مظہر عباس کے مطابق، پاکستان پریس انٹرنیشنل کے اسلام آباد بیورو چیف، اسماعیل کی لاش اسلام آباد میں ان کے گھر کے قریب اس حالت میں ملی تھی کہ ان کے سر کو کسی "سخت کند چیز سے کچل دیا گیا تھا"۔ دی ایسوسی ایٹڈ پریس نے اطلاع دی کہ پولیس تفتیش کار کا کہنا تھا کہ شاید لوہے کی کسی چھڑ کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

ریٹائر ہونے والے اسماعیل کو آخری بار پچھلی رات کو اس وقت دیکھا گیا تھا جب وہ چہل قدمی کے لیے اپنے گھر سے نکل رہے تھے۔ جب ان کی لاش ہسپتال پہنچائی گئی تو اسے وصول کرنے والے ڈاکٹر نے جرنلسٹس یونین کو بتایا کہ اسماعیل کی لاش دریافت ہونے سے چند گھنٹے پہلے ہی ان کی موت ہو چکی ہے۔

اسماعیل کے اہل خانہ نے عباس کو بتایا کہ انہیں اس بات کا صدمہ ہے کہ کیا چیز حملے کا محرک ہو سکتی ہے۔ انہوں نے انہیں بتایا کہ جس وقت اسماعیل پر حملہ کیا گیا تھا اس وقت ان کے پاس معمولی مالیت کی چیزیں تھیں۔ CPJ کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اسماعیل کی اخباری ایجنسی خاص طور پر حکومت کی تنقیدی رپورٹنگ کے لیے نہیں جانی جاتی ہے۔

خادم حسین شیخ، سندھ ٹی وی اور *خبریں*
14 اپریل 2008، حب

پاکستانی فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کے مطابق، سندھ ٹی وی کے اسٹرنگر اور قومی سطح کے اردو زبان کے روزنامہ *خبریں* کے مقامی بیورو چیف کو نامعلوم بندوق برداروں نے اس وقت ہلاک کر دیا جب وہ کراچی سے لگ بھگ 25 میل (40 کلو میٹر) دور شمال میں موٹربائیک سے اپنے گھر سے نکلے۔

جرنلسٹس یونین کے اس وقت کے سکریٹری جنرل مظہر عباس نے CPJ کو بتایا کہ انہوں نے ٹیلیفون پر شیخ کے بھائی اسحاق سے بات کی تھی جو اس حملے کے وقت خود بھی اسی موٹربائیک پر سوار تھے اوربندوق کی گولیوں سے ہونے والے زخموں کے سبب ہسپتال میں بھرتی ہوئے تھے۔ عباس کے مطابق، اسحاق نے بتایا کہ موٹر بائیکس پر سوار تین آدمیوں نے گولیاں چلائیں، اور پھر جائے وقوعہ سے فرار ہونے سے پہلے یہ یقین کر لیا تھا کہ صحافی کی موت ہو گئی ہے یا نہیں۔ عباس کے بقول بھائی نے بتایا کہ وہ اس قتل کا باعث بن سکنے والے کسی جھگڑے سے لاعلم تھے۔

راجا اسد حمید، *دی نیشن* اور وقت ٹی وی
26 مارچ 2009، راولپنڈی

نامعلوم بندوق برداروں نے انگریزی زبان کے روزنامہ *دی نیشن* اور اس کے اردو زبان کے ٹیلی ویژن چینل، وقت کے رپورٹر کو اس وقت ہلاک کر دیا جب وہ اپنے گھر پر اپنی کار کھڑی کر رہے تھے۔

اس حملے کے سلسلے میں میڈیا کے بیانات مختلف ہیں۔ میڈیا اور حقوق انسانی کی سرگرم کارکن، بینا سرور نے اس معاملے پر گہری نظر ڈالی اور وہ جس نتیجے پر پہنچیں وہ CPJ کو بتایا: "ان کے اہل خانہ گولیوں کی آواز سن کر باہر نکلے اور حمید کو خون میں لت پت دیکھا۔ بالکل قریب سے چلائے گئے بلیٹ نے ان کی گردن اور کندھے میں سوراخ کردیا تھا۔" بے نظیر بھٹو ہسپتال میں پہنچنے پر ڈاکٹروں نے انہیں مردہ قرار دے دیا۔

حمید جانی مانی شخصیت تھے۔ وہ انگریزی، اردو، اور پنجابی میں رواں گفتار تھے اور اکثر و بیشتر الجزیرہ پر آکر پاکستان میں سیاسی پیشرفت کا تجزیہ کرتے تھے۔

حملے کے اگلے دن، وزیر اطلاعات قمر الزماں کیرا نے باضابطہ ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کو بتایا کہ "راولپنڈی میں صحافی کا قتل ضرور گھناؤنی حد تک گرنے والے مجرموں نے کیا ہے"، اور انہوں نے وعدہ کیا کہ "اس نفرت انگیز قتل کی تفتیش میں کسی طرح کی کثر چھوڑی نہیں جائے گی"۔ اخباری رپورٹوں نے بتایا کہ راولپنڈی پولیس نے بعد میں بغیر کوئی حل نکالے اپنی تفتیش بند کر دی۔

وصی احمد قریشی، *ڈیلی آزادی* اور *بلوچستان ایکسپریس*
16 اپریل 2009، خضدر

قریشی کے ایڈیٹر اور مقامی اخباری رپورٹوں کے مطابق، بندوق برداروں نے 11 اپریل کو بلوچستان کے شمال مغربی صوبے کے خضدر ضلع میں ایک نیوز اسٹینڈ کے قریب قریشی اور ان کے رفیق کار، محمد صدیق موسیانی پر بندوقوں کے دہانے کھول دیے۔

اخباری رپورٹوں میں بتایا گیا کہ بندوق کی گولی سے لگنے والے زخموں کے مدنظر ایک مقامی ہسپتال میں قریشی کا علاج کرایا گیا لیکن پانچ دن کے بعد ان کی موت ہو گئی۔ رپورٹوں کے مطابق، موسیانی زندہ بچ گئے۔

کوئٹہ کے اخبار *ڈیلی آزادی* کے ایڈیٹر آصف بلوچ کے مطابق، قتل کا محرک فوری طور پر واضح نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ مقامی اہلکاروں کے بقول وہ تفتیش کر رہے ہیں لیکن کوئی کامیابی نہیں ملی ہے۔ حالانکہ کچھ اخباری رپورٹوں میں بتایا گیا کہ بلوچستان لبریشن آرمی سے تعلق رکھنے والے علاحدگی پسندوں نے یہ گولی باری کی تھی۔ بلوچ نے بتایا کہ انہوں نے ذمہ داری قبول نہیں کی ہے اور اس صحافی پر حملہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں معلوم ہے۔

صدیق باچہ خان، آج ٹی وی
14 اگست 2009، مردان

آج نے اپنی ویب سائٹ پر رپورٹ شائع کی کہ نامعلوم بندوق برداروں نے شمالی مغربی سرحدی صوبے میں جس کو اب خیبر پختونخواہ کے نام سے جانا جاتا ہے، مردان شہر میں نامہ نگار باچہ خان پر اچانک حملہ کر دیا گیا۔

چینل کے بیورو چیف امتیاز اعوان نے اسٹیشن کی ویب سائٹ پر بتایا کہ ان پر بالکل قریب سے اس وقت گولی چلائی گئی جب وہ طالبان کے ذریعے ہلاک کیے گئے ایک سابق فوجی اہلکار کے اہل خانہ کا انٹرویو کرنے کے بعد اسٹیشن کے دفتر واپس آ رہے تھے۔ آج اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے مطابق، ہسپتال جاتے ہوئے راستے میں صحافی کی موت ہو گئی تھی۔

لالہ حمید بلوچ، *ڈیلی انتخاب*
18 نومبر 2010، تربت، پاکستان کے باہری علاقے میں

گوادر پریس کلب کے مطابق، حمید اپنے گھر گوادر میں واپس جاتے ہوئے 25 اکتوبر کو غائب ہو گیے۔ لاپتہ ہونے کے بعد مغربی بلوچستان شہر تربت کے باہر گولیوں سے چھلنی حالت میں ان کی لاش ملی تھی۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے سابق سکریٹری جنرل مظہر عباس کے مطابق، مقامی صحافیوں کا ماننا تھا کہ انہیں پاکستانی سیکیورٹی اہلکاروں کے ذریعے اگوا کیا گیا تھا ۔

عباس نے بتایا کہ حمید اردو زبان کے *ڈیلی* کے لیے رپورٹنگ کرتے تھے اور انہوں نے دیگر متعدد اخباری اداروں کے لیے بھی اسٹرنگر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ بلوچ نیشنلسٹ ویب سائٹ اور مقامی اخباری رپورٹوں کے مطابق، وہ ایک خود مختار بلوچستان کی وکالت کرنے والی سیاسی تنظیم بلوچستان نیشنل موومنٹ کے ایک سرگرم حمایتی تھے۔ پاکستان پریس فیڈریشن کے سکریٹری جنرل اویس اسلم علی کے مطابق، ان کی رپورٹنگ اور ان کی سیاسی سرگرمیوں دونوں ہی کو ان کے قتل کے ممکنہ محرکات خیال کیا گیا تھا۔

مقامی اخباری رپورٹوں کے مطابق، بلوچ کے ساتھ ہی ایک اور شخص، حامد اسماعیل کی لاش دریافت ہوئی تھی۔ لاہور کے *ڈیلی ٹائمز* اخبار کے مطابق، عید کی تین روزہ تقریبات کے دوران جس کا اختتام 19 نومبر 2010 کو ہوا تھا، پورے بلوچستان میں چار دیگر لاشیں بھی ملی تھیں۔ رشتہ داروں کا الزام تھا کہ سرکاری اہلکاروں نے متاثرہ شخص کی سیاسی فعالیت پسندی کے مدنظر انہیں نشانہ بنایا ہے۔

محمود چاندیو، آواز
5 دسمبر 2010، میر پور خاص

اخباری رپورٹوں کے مطابق، سندھی زبان کے ٹیلیویژن اسٹیشن آواز کے بیورو چیف اور مقامی پریس کلب کے صدر چاندیو کو حملہ آوروں نے میر پور خاص، صوبہ سندھ میں ان کے گھر کے باہر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے سابق صدر، مظہر عباس کے مطابق، جب چاندیو نے اپنے دروازے پر ہونے والی دستک کا جواب دیا اسی وقت بندوق برداروں نے انہیں کم از کم دو گولیاں مار دیں۔ ایک مقامی ہسپتال لے جائے جانے کے بعد45 سالہ چاندیو کی موت ہو گئی۔

محرک فوری طور پر واضح نہیں تھا۔ میڈیا کے معاون گروپ رورل میڈیا نیٹ ورک پاکستان نے بتایا کہ چاندیو کو خاندانی اور کاروباری معاملات کے تعلق سے دھمکیاں ملی تھیں۔ وہ صوبہ سندھ کے لیے آزادی کی خواہاں سیاسی جماعت، جیے سندھ قومی محاذ کے ایک سابق ممبر بھی تھے۔ مقامی میڈیا رپورٹوں کے مطابق، انہوں نے پسماندگان میں اپنی بیوی، ماں، اور چھ بچوں کو چھوڑا۔

الیاس نظار، درونتھ
3 جنوری 2011، پیڑارک

مقامی اخباری رپورٹوں میں بتایا گیا کہ نظار کی لاش ان کی گمشدگی کی اطلاع درج کرائے جانے کے چھ دن بعد، پڑارک، صوبہ سندھ میں ایک کچی سڑک کے کنارے اس حالت میں ملی تھی کہ اس پر گولیوں کے زخموں کے متعدد نشانات موجود تھے۔

نظار کی لاش کے ساتھ ہی بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے سربراہ قمبر چاکر کی بھی لاش تھی، جو 27 نومبر 2010 کو تربت میں واقع اپنے گھر سے غائب ہوگئے تھے۔ کچھ مقامی اخباری رپورٹوں کے مطابق، نیوز میگزین درونتھ کے جنرل اسائنمنٹ رپورٹر، نظار کو ایک مشہور سرگرم کارکن بھی خیال کیا جاتا تھا۔

عبدوست رند، فری لانس
18 فروری 2011، تربت

اردو زبان کے ایک اخبار *ڈیلی ایگل* کے 27 سالہ جزء وقتی رپورٹر، رند کو بلوچستان کے تربت میں چار گولیاں ماری گئی تھیں اس کے بعد حملہ آور موٹرسائیکل پر سوار ہو کر فرار ہو گئے تھے۔ مقامی اخباری رپورٹوں میں کہا گیا کہ جائے وقوعہ پر ہی ان کی موت ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا تھا۔

رند جو علاحدگی پسند تحریک کے، جو بلوچستان کے لیے عظیم تر خود مختاری اور بالآخر پاکستانی تسلط سے الگاؤ کی خواہاں تھے، ایک سرگرم کارکن بھی تھے۔ سرکاری فوجی اور انٹلیجنس آپریشنز میں اکثر و بیشتر سرگرم کارکنان کو نشانہ بنایا گیا، اور بہت سارے بلوچ صحافیوں نے سیاسی فعالیت اور صحافت کے بیچ کی لکیر پر پھنس گئے تھے ۔

زماں ابراہیم، *ڈیلی ایکسٹرا نیوز*
2 اپریل2011، کراچی

پاکستانی اخباری رپورٹوں کے مطابق، ابراہیم اپنی موٹرسائیکل سے جا رہے تھے کہ موٹر سائیکل پر سوار دو افراد نے ان کے سر میں گولی مار دی۔ اس صحافی نے اردو زبان کے متعدد چھوٹے اخباروں کے لیے کام کیا تھا۔ وہ حزب اختلاف متحدہ قومی موومنٹ اور عوامی نیشنل پارٹی کی مسلح جنگجوئیت کے سامنے حکمراں پاکستان پیوپلز پارٹی کی جنگجوئیت کاؤنٹرپوائنٹ، پیوپلز امن کمیٹی نامی ایک مقامی گروپ کے ساتھ بھی شامل تھے۔ یہ گروپس اپنی پرتشدد چالبازیوں کے لیے جانے جاتے ہیں۔

40 سالہ ابراہیم کے دو بچے تھے۔ یوں تو انہوں نے کئی سالوں تک متعدد مختلف اردو اخبارات کے لیے کام کیا تھا، مگر ان کی حالیہ ترین ملازمت *ڈیلی ایکسٹرا نیوز* میں تھی۔ پولیس نے گولی باری کی تفتیش کرتے ہوئے رپورٹروں کو بتایا کہ ان کو یقین ہے کہ انہیں پارٹی کے اندرونی تنازعہ کی بنا پر ہلاک کیا گیا ہے۔

منیر شاکر، *آن لائن نیوز نیٹ ورک*، سبز بات ٹی وی
14 اگست 2011، خضدر

ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے مطابق، شاکر کو جو *آن لائن نیوز نیٹ ورک* کے لیے لکھتے تھے اور جو بلوچ ٹیلی ویژن اسٹیشن سبز بات کے نامہ نگار بھی تھے، دوپہر بعد موٹرسائیکل پر سوار دو افراد نے اس وقت پے در پے گولیاں ماریں جب وہ بلوچستان کے مرکز میں ضلعی راجدھانی، خضدر میں واقع پریس کلب سے گھر جا رہے تھے۔

بلوچستان یونین آف جرنلسٹس میں شاکر کے رفقائے کار نے بتایا کہ یہ 30 سالہ رپورٹر قریب آٹھ سالوں سے ایک صحافی کی حیثیت سے مسلسل کام کر رہا تھا، اور اس کو نشانہ بنا کر دی جانے والی کسی دھمکی کا انہیں علم نہیں ہے۔ لیکن میڈیا کے ایک معاون

گروپ، پاکستان پریس فاؤنڈیشن کے نمائندوں نے CPJ کو بتایا کہ شاکر بلوچ علاحدگی پسند تنظیموں کے ایک سرگرم کارکن بھی تھے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں نشانہ بنانے کی شاید یہی وجہ ہو۔

اورنگزیب ٹونیو، کاوش ٹیلی ویژن نیٹ ورک
10 مئی 2012، لالو رینواک

اخباری رپورٹوں میں بتایا گیا کہ مسلح افراد کے ایک گروپ نے مشہور سندھی نیوز چینل کاوش ٹیلی ویژن نیٹ ورک کے رپورٹر، ٹونیو کو راجدھانی اسلام آباد سے لگ بھگ 535 میل (850 کلو میٹر) دور جنوب میں صوبہ سندھ کے لالو رینواک نامی گاؤں میں اسٹیشن کے بیورو کی حیثیت سے مستعمل ایک چھوٹے سے دفتر میں گولی مار دی۔ رپورٹوں میں بتایا گیا کہ ٹونیو کے بھائی رستم، اور ان کے دوست دیدار خاص خیلی کو بھی ہلاک کر دیا گیا تھا۔

مقامی صحافیوں نے CPJ کو بتایا کہ بندوق بردار مغیری قبیلے کے افراد تھے، جو ٹونیو کے قبائلی گروپ کا حریف تھا۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ ان کو یقین ہے کہ ٹونیو کے قتل کی وجہ ان کی وہ رپورٹ تھی جس میں انھوں نے حریف طبقے کے دو ممبروں کے بیچ شادی کی ناکام کوشش کی کہانی بیان کی تھی۔

Committee to Protect Journalists
330 7th Avenue, 11th Floor
New York, NY 10001

Web: www.cpj.org
Twitter: @pressfreedom
Facebook: @committeetoprotectjournalists

Email: info@cpj.org
Tel: 212-465-1004